یو جی سی کیر لسٹیڈ بین الاقوامی پیر ریویو ریفریڈ جرنل
اندراج نمبر۔ ۳۰

سہ ماہی

تاریخ ادب اردو

دہلی

اردو ادب کا نقیب و ترجمان

اپریل تا جون

جلد۔ ۴ر شمارہ۔ ۲

2022

مدیر: پروفیسر محمد یحیٰ صبا

سہ ماہی دہلی

تاریخ ادب اردو

اردو ادب کا نقیب و ترجمان

جلد:۴ ﴿اپریل تا جون ۲۰۲۲﴾ شمارہ:۲

سرپرست اعلیٰ: پروفیسر ارتضیٰ کریم

مدیر: پروفیسر محمد یحییٰ صبا

مینیجنگ ایڈیٹر: ڈاکٹر واثق الخیر ایسوسی ایٹ ایڈیٹر: ڈاکٹر محمد بہلول

خط و کتابت/ترسیل وزر کا پتہ

سہ ماہی تاریخ ادب اردو دہلی، ۲۴۹۶، دوسری منزل، پنجابی بستی، سبزی منڈی، گھنٹہ گھر، دہلی۔۱۱۰۰۰۷

2496, 2nd Floor, Punjabi Basti, Sabji Mandi, Ghanta Ghar, Delhi-07

E-mail:editorurdu@gmail.com

website:tareekheadabeurdu.com

Mobile No.:+91-9968244001/9810383617

اس شمارہ کے مشمولات سے مدیر/وابستگان کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ کسی بھی تحریر/اقتباس کے لیے مضمون نگار خود ذمہ دار ہے۔ ''تاریخِ ادب اردو'' سے متعلق کسی بھی تنازعہ کا حق سماعت صرف دہلی کی عدالت میں ہوگا۔

UGC Care Listed International Peer Reviewed Refereed Journal. ISSN:2582-1229/E-ISSN:2582-9157

سرپرست

پروفیسر راکیش کمار پانڈے (شعبہ علم طبیعات، کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی)
پروفیسر محمد رضی الرحمٰن (صدر شعبہ اردو، گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور)
پروفیسر کوثر مظہری (شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی)
پروفیسر محمد علی جوہر (شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)
پروفیسر ندیم احمد (شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی)
پروفیسر محمد کاظم (شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی)
پروفیسر محمد قمر الہدیٰ فریدی (شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)
پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی (شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)
پروفیسر عذرا عابدی (شعبہ سماجیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی)
پروفیسر پرمود کمار بھارتی (شعبہ سنسکرت، میونسپل پی جی کالج مسوری، اتراکھنڈ)

مجلس مشاورت

اندرون ملک:

ڈاکٹر محمد محسن (دہلی)، ڈاکٹر نوشاد مومن (کولکاتہ)، ڈاکٹر دانش الہ آبادی (الہ آباد)، ڈاکٹر مجیب احمد خان (دہلی)، پروفیسر آلِ ظفر (مظفر پور)، ڈاکٹر مشتاق عالم قادری (دہلی)، ڈاکٹر محمد افروز عالم (کشمیر)، ڈاکٹر شاہد رزمی (بھاگل پور)، ڈاکٹر سیف الدین احمد (دہلی)، پروفیسر عقیلہ سید غوث (بیدر، مہاراشٹر)، ڈاکٹر نادرہ خاتون (کوٹہ، راجستھان)، ڈاکٹر بلرام شکلا (دہلی)، ڈاکٹر فیاض عالم (دہلی)، پروفیسر زیبا محمود (گورکھپور)، ڈاکٹر صبیحہ پروین (بھاگل پور)، دین رضا اختر (ارریا)، ڈاکٹر محمد شہزاد شمس (ارریا)، وسیم فرحت علیگ (امراوتی، مہاراشٹر)، شکیبہ عمر (دہلی)، فرخندہ ضمیر (راجستھان)، محمد فہیم احمد (کوٹہ، راجستھان)، مولانا رضوان ندوی (پورنیہ)، ڈاکٹر تسنیمہ پروین (رانچی)، ہاجرہ نور احمد زریاب (شولاپور، مہاراشٹر)، ڈاکٹر رشی کمار شرما (وارانسی)، قیصر رضا (چترا، جھارکھنڈ)

بیرون ملک:

پروفیسر یوسف خشک، پروفیسر صوفیہ خشک، پروفیسر ضیاء الحسن، ڈاکٹر محمد سلمان بھٹی، پروفیسر ثمینہ گُل، ڈاکٹر محمد افضل بٹ، عظمی نورین، ڈاکٹر ریحانہ کوثر (پاکستان)، پروفیسر احمد القاضی (مصر)، پروفیسر حلیل طوقار، پروفیسر دُرمُش بُلگر، ڈاکٹر ذکائی کارداس (استنبول، ترکی)، فرزانہ اعظم لطفی، ڈاکٹر علی بیات، ڈاکٹر محمد کیومُرسی (تہران، ایران)

قانونی مشیر:

ایڈوکیٹ انل کمار سنگھ، ایڈوکیٹ سیما سنگھ (دہلی)، ایڈوکیٹ محمد ضیاء القمر (پٹنہ)

زر تعاون:

فی شمارہ۔ 150/	خصوصی شمارہ- 400/-
سالانہ- 1800/-	خصوصی تعاون- 5000/-

A/C Name:- PEACE INDIA FOUNDATION

A/C No.:- 51521131001918

IFSC:- PUNB515210

مالک، طابع وناشر ڈاکٹر محمد یحیٰی صبا نے جے کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس، سے چھپوا کر دفتر ''تاریخ ادب اردو''
۲۴۹۶، دوسری منزل، پنجابی بستی، سبزی منڈی، گھنٹہ گھر، دہلی۔۱۱۰۰۰۷ سے شائع کیا۔

فہرست

☆ اداریہ:		4
☆ ریت سمادھی: انسان دوست ناول	ڈاکٹر واثق الخیر	7
☆ تصوف کے شاعر: خواجہ میر درد	پروفیسر محمد یحییٰ صبا	14
☆ اخلاق جلالی کا ایک تخلیقی جائزہ	ڈاکٹر محمد یاسین کمبے	23
☆ ایران میں بچوں اور نوجوانوں کے ادب	ڈاکٹر محمد افروز عالم	35
☆ داراشکوہ، سفینۃ الاولیا، اور صوفی خواتین	ڈاکٹر محسن علی	45
☆ کوٹہ میں اردو شاعری	محمد فہیم احمد	54
☆ خلیق الزماں نصرتؔ: محقق، نقاد اور شاعر	ڈاکٹر غوث احمد شیخ	60
☆ ایوان غزل کے نسائی کردار: ایک تانیثی مطالعہ	ڈاکٹر محمد کاشف	68
☆ قرۃ العین حیدر کی سفر نامہ نگاری: ایک جائزہ	ڈاکٹر نشاں زیدی	77
☆ منشی محمد حسین عاشقؔ دہلوی	سیما بھاٹی	88
☆ جنوبی ایشیا میں CPEC کی اہمیت۔۔۔	مظفر حسین	95
☆ سیمین دانشور کا نسائی شعور: ایک مطالعہ	عابد حسین ڈار	105
☆ معاصر فارسی ادب کے آبشار: ایک جائزہ	آصف علی احمد	112
☆ پریم چند کا افسانہ 'کفن': انسانی شکست۔۔۔	ڈاکٹر فیاض عالم	117
☆ زاہدہ حنا کے کالموں میں عورت کا تصور	ڈاکٹر ریحانہ کوثر	124
☆ فکر دینی کی تثلیث:۔۔۔	ڈاکٹر عارف اشتیاق	136

اداریہ:

قارئین اپریل تا جون کا شمارہ آپ کے سامنے ہے۔اس شمارے میں مختلف موضوعات پے مضامین شامل ہیں۔ہم نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ الگ الگ طرح کے مضامین شامل ہوجائیں۔اس شمارے کے لیے ہمارے پاس کئی مضامین آئے،ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے سبھی مضامین کوشامل نہیں کیا ہے۔آئندہ کے شمارے میں ہم ان مضامین کوشامل کریں گے۔

میگزین کے اشاعتی مرحلے میں ایک خبر آئی کہ ہندی ساہتیہ کے گیتا نجلی شری صاحبہ کو ان کے ناول ''ریت سمادھی'' کے انگریزی ترجمے ''Tomb of Sand'' کو انٹرنیشنل بکر پرائز (International Booker Prize) ملا ہے۔یہ ساؤتھ ایشیا کا پہلا ناول ہے جس نے انٹرنیشنل بکر پرائز حاصل کیا۔ریت سمادھی کا انگریزی ترجمہ ''ڈیزی راک ویل'' نے کیا ہے۔

بکر پرائز کے لیے فیصلے لینے والی کمیٹی نے اس کا انتخاب کرتے وقت کہا کہ اس ناول میں سب کچھ ہے۔اس میں زندگی ہے،موت ہے اور بہت گہرا مطالعہ ہے جو باتوں کا سچ ہے۔اس کہانی میں گیتا نجلی شری ہندو پاک کی سرحد سے پرے تو جاتی ہی ہیں لکھنے اور کہنے کے انداز میں بھی نئی تصویر کھینچتی ہیں۔ہندی ساہتیہ کو یہ انعام ملنا خوش آئند بات ہے۔بلکہ یہ انعام ملنے سے ہندی ساہتیہ کو بین الاقوامی سطح پر ایک پہچان ملی ہے۔ابھی گزشتہ برس بنگالی زبان میں لکھا گیا ناول کو نوبل انعام ملا تھا۔ایسا نہیں ہے کہ اس سے قبل بین الاقوامی سطح پر اردو زبان میں لکھا ہوئے ادب کو وہ مقبولیت نہیں ملی،مقبولیت تو ضرور ملی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اس ادب کو انگریزی اور دنیا کی دیگر بڑی زبانوں میں ترجمہ کیا جاتا تو ہوسکتا تھا کہ انہیں بھی ایسے انعامات نوازا جاتا۔ایک واقعہ پڑھا تھا کہ جنگ آزادی کے رہنما عنایت اللہ مشرقی نے ۳۶ سال کی عمر میں ''تذکرہ'' نام سے اردو میں ایک کتاب لکھی جسے ۱۹۲۵ میں نوبل انعام کے لیے منتخب کیا گیا۔لیکن انہیں نوبل انعام صرف اس لیے نہیں ملا کہ انہوں نے کتاب کا کسی بھی یوروپی زبان میں ترجمہ کرنے کی اجازت دینے سے انکار کردیا تھا۔کیوں کہ ان کو یہ گوارا نہیں تھا کہ کوئی بھی ہندوستانی زبان میں لکھا ہوا ادب کو حقیر نظر سے دیکھے۔یہ ان کا نظریہ تھا کہ جو پرھنے کے شائقین ہیں وہ اس کی اصل کو پڑھیں

گے۔ خیر اس بحث سے پرے آج بھی ہندی کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں ایسے ناول اور کہانیاں لکھی جارہی ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان ناولوں کے بہترین انگریزی ترجمے کیے جائیں اور دنیا کو اردو ادب سے روسناش کرایا جائے۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ انعام کا انتخاب کرتے وقت ''ریت سمادھی'' کا اصل ورژن سامنے نہیں تھا بلکہ اس کا ترجمہ Tomb of Sand کی مقبولیت کی بنیاد پر اسے انعام دیا گیا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ ترجمہ کرنے والے ڈیزی راک ویل نے اس کتاب کا ترجمہ خوب بہترین کیا ہوگا۔ اور اس ترجمے کو گیتانجلی شری صاحبہ نے بھی ایک نظر دوڑائی ہوگی اور رضامندی ظاہر کی ہوگی۔ غیر ہندی داں کے درمیان اس کتاب کو جو مقبولیت ملی وہ ترجمے کی بنیاد پر ہی ملی۔ ترجمہ کرنے والے ڈیزی راک ویل بھی مبارک باد کے برابر کے مستحق ہیں۔ اب اس کا مطلب یہ ہوا کہ ادب میں ترجمہ کی بھی بہت اہمیت ہے۔ ترجمہ ایک زبان کے ادب سے دوسری قوموں کو متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ ترجمے ذریعہ صرف ادب کا ہی تبادلہ نہیں ہوتا بلکہ تہذیب وتمدن کا بھی تبادلہ ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اردو میں بھی ترجمے کی روایت کو آگے بڑھایا جائے۔ اور اردو کے سرمائے سے غیر اردو داں کو واقف کرایا جائے۔ اس کے لیے یونیورسٹیوں کے شعبہ اردو کے نصاب میں باضابطہ ترجمہ نگاری کو شامل کیا جائے اور طلباء و طالبات کے ذریعہ اردو ناولوں اور کہانیوں کے ترجمے کروائے جائیں۔ اردو اداروں کے ذریعہ فیلوشپ کی مدد سے بھی اردو کے سرمائے کو ترجمے کے ذریعہ منتقل کیا جائے۔ اس سلسلے میں ہمارا شاندار ماضی رہا ہے۔ انگریزی زبان میں لکھی گئی سائنس اور دیگر کتابوں کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ اردو کے سرمائے کو انگریزی اور دنیا کی دوسری بڑی زبانوں میں منتقل کیا جائے۔

ادھر کچھ دنوں سے ایک آواز اٹھ رہی تھی کہ اردو کو اردو فارسی املا (اسکرپٹ) میں ہی لکھا جائے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ املا میں تبدیلی کرنے کی کس نے بات کی یا تحریک چلائی۔ اس کی پہچان کی جائے اور اس سے مثبت بحث کی جائے تاکہ زبان کے سلسلے میں بہتر موقف سامنے آسکے جس سے اردو زبان کے شائقین کو مثبت فائدہ ہو۔ جہاں تک انٹرنیٹ کے ذریعہ اردو شاعری کو غیر اردو داں تک پہچانے کے لیے دیوناگری یا رومن اسکرپٹ میں لکھا جارہا ہے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے بلکہ اردو زبان وادب کو زیادہ ہی مقبولیت مل رہی ہے۔ ہاں یہ کیا جاسکتا ہے کہ جہاں آپ دیوناگری یا رومن

اسکرپٹ استعمال کررہے ہیں وہیں آپ اردواملا میں بھی اسی مواد کولکھ دیں۔تاکہ اردو کے شائقین اردو املا سے بھی آشنا ہوسکیں۔میرا ماننا ہے کہ اردواور ہندی جیسے کچھ زبانوں کی پہچان ہی اس کی اسکرپٹ سے ہے جیسے ہی اسے دوسرے اسکرپٹ میں لکھنا شروع کریں گے اس کی اصل ہی ختم ہوجائے گی۔خاص طور سے ان دونوں زبانوں کوایک دوسرے کی اسکرپٹ میں لکھنے سے پہلی ہی نظر میں اس کی اسکرپٹ کے مطابق اردو ہندی بول دیا جائے گا۔اس سلسلے میں بہت زیادہ واویلا مچانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ خاموشی سے اپنے بچوں کواردواسکرپٹ سے روشناس کرایئے۔آج کی نسل اردو میں اپنا نام تک نہیں لکھ سکتی ہیں پڑھنا تو دور کی بات ہے۔

ہم اپنے قارئین سے امید کرتے ہیں کہ وہ غیر ضروری مباحثے میں پڑنے کے بجائے دل اور من لگا کر علم کی حصول یابی میں لگے رہیں۔اوراپنے مستقبل کوسنوارنے میں پوری طرح جد و جہد کریں۔کیوں کہ اگرآپ کا حال بہتر ہے تو آئندہ کی نسلوں کا مستقبل خود بخود بہتر ہوگا۔سخت سے سخت حالات آئیں گے اس سے قبل بھی بہت مشکل حالات سے ہمارے اپنوں نے گزارے ان سب کا مقابلہ انہوں نے بھی کیا آپ کو بھی کرنا ہے اور ملک وقوم کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتے رہنا ہے۔

مدیر

ڈاکٹر واثق الخیر
Managing Editor, Tareekh e Adab e Urdu, Delhi

ریت سمادھی: انسان دوست ناول

تلخیص:

گیتانجلی شری کا ناول 'ریت سمادھی' جسے انٹرنیشنل بکر پرائز سے سرفراز کیا گیا۔ ۳۹۷ صفحات پر مشتمل یہ ناول ۸۰ سالہ عورت کے پس پشت چلنے والی کہانی ہے۔ یہ کہانی دہلی سے شروع ہوتی ہے کئی مرحلوں سے گزرتے ہوئے پاکستان پہنچتی ہے۔ اس ناول میں سب کچھ ہے۔ اس میں زندگی ہے، موت ہے اور بہت گہرا مطالعہ ہے۔ رشتوں کے تانے بانے میں بُنا یہ ناول بہت سے مسائل پر روشنی ڈالتا ہے۔ معاشرے کی ان توقعات کو بھی ظاہر کرتا ہے جو روایتی طور پر عورت سے رکھتی ہیں۔ اخلاقی پولیسنگ سے پیدا ہونے والے تنازعات، پدرانہ نظام کے خلاف اٹھنے والی نرم آواز سے سیاست کے دوغلے پن تک، ماحول کی فکر، فرقہ واریت، تقسیم، محبت کی آواز کے ساتھ ساتھ ہندو و پاک کی سیاست بھی اس ناول میں سامنے آتی ہے۔ زبان و بیان کا نرالا انداز ہے جو اس ناول کی خاص خوبی ہے۔

کلیدی الفاظ: معاشرہ، پدرانہ نظام، مردانگی، حقوق نسواں، سیاست، ماحولیات، فرقہ واریت، خواجہ سراء، تقسیم، ہندو پاک کی سیاست، رشتے، جذبات، ستم ظریفی، علیحدگی اور خوابوں کی توقعات۔

ہندی کی مشہور ادیبہ گیتانجلی شری کا "ریت سمادھی" پانچواں ناول ہے۔ اس سے پہلے ان کے چار ناول 'مائی'، 'ہمارا شہر اس برس'، 'تیرو ہوت' اور 'خالی جگہ' شائع ہو چکے ہیں۔ گیتانجلی شری نے کئی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ یہ کہانیاں مجموعہ کی صورت میں 'انوگونج'، 'ویرا گیا' اور 'یہاں ہاتھی رہتے تھے' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی نمائندہ کہانیوں کا ایک الگ مجموعہ 'پرتی نیدھی کہانیاں' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔ ان کی کہانی میں پُر جوش اور نفسیاتی تجزیے کا جادو چھایا ہوا ہے۔ ناول 'ریت سمادھی' کا ترجمہ ڈیزی راک ویل نے انگریزی میں کیا ہے۔ فرانسیسی زبان میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ ناول شمالی ہندوستان کے پس منظر میں لکھا گیا ہے اور اس میں ایک ۸۰ سالہ

بزرگ خاتون کی کہانی بیان کی گئی ہے۔لیکن اس کے پس منظر میں ہر وہ چیز ہے جو ناول کو عمدہ بناتا ہے۔

گیتا نجلی شری کا کہنا ہے کہ وہ چار لائنوں میں نہیں بتا سکتی کہ اس ناول کی کہانی کیا ہے، کیونکہ یہ ایک 'کہانی' نہیں ہے۔اس کے ہر صفحے پر ایک نئی کہانی جنم لیتی ہے۔اس میں ہر پیراگراف میں ایک نیا کردار داخل ہوتا ہے اور اپنی کہانی سنانے لگتا ہے۔ بے جان چیزیں بھی اس میں زندہ ہو جاتی ہیں، اور اپنی کہانیاں سنانے لگتی ہیں۔گھر کا دروازہ، دیواریں، لاٹھی، درخت اور پودے، پرندے اور تتلیاں اور ریت اور ہوا۔

ریت سمادھی ویسے یہ ایک عام ناول ہے اور اس میں ایک مرکزی کہانی ہے جس میں کئی ذیلی کہانیاں ہیں۔جس طرح سے یہ کہانیاں سنائی جاتی ہیں (یا لکھی جاتی ہیں) اس میں کتھا لوک کے ساتھ ایک وسیع کاویہ لوک بھی ہے۔اس ناول میں ایک الگ قسم کی کہانی بھی ہے۔

روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات اور انوکھی تصویروں کی انگلی پکڑ کر ذہن کی ناہموار گہرائیوں میں اتر جانے کی کہانی ہے، جہاں کبھی آسمان، گھر، پرندہ، کبھی اندھیرا، بے چینی اور چیخ و پکار۔کبھی کبھی دکھ ہے اور کبھی تکلیف۔تو بس یوں کہہ لیجیے کہ یہ ناول ایک مکمل خیال ہے، جو پوری طرح سے بھرا ہوا ہے، اتنا ہی خالی ہے جتنا ہونا چاہیے اور اتنا بھرا ہوا ہے کہ جتنا کہ اس کا خالی پن زور زور سے بولے، اس کے الفاظ گونج اٹھیں۔

ناول 'ریت سمادھی' میں کس طرح ایک عام ہندوستانی خاندان کی عورت، جو ڈپریشن کا شکار ہے، سرحد پار کر کے پاکستان آنے کا فیصلہ کیسے کرتی ہے، کس طرح وہ خود کو اس ڈپریشن سے نکالتی ہے۔اپنے ہنر میں یہ ناول تحریر کی بہت سی بنی ہوئی حدود کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے مزاج میں نئے پیرایہ بھی پیدا کرتا ہے۔ناول رشتوں کے تانے بانے میں، بہت سے مسائل کی کھوج کرتا ہے۔معاشرے کی عورت سے توقعات، اپنے طے شدہ راستے سے ہٹنے سے پیدا ہونے والا تنازعہ، پدرانہ نظام، مردانگی، حقوق نسواں، سیاست، ماحولیات، فرقہ واریت، خواجہ سراء کے مسائل، برین ڈرین، تقسیم، ہندو پاک کی سیاست اور محبت بھی۔ناول 'ریت سمادھی' رشتوں کے، بہت قریب تر ہے۔متوسط طبقے کے خاندان کے معمولات، رشتوں، دلائل، جذبات، ستم ظریفی، لگاؤ، علیحدگی اور خوابوں کی توقعات کی عکاسی کرتی ہے۔ایسے گھرانے کی دو عورتیں، ایک بیٹی اور ایک ماں، ایک عمر میں بڑی اور چھوٹی، ایک سنجیدہ اور ذمہ دار اور دوسری آزاد اور آباد، کہانی کا محور ہیں جن پر پورا ناول گھومتا ہے۔ریت سمادھی میں ماں اور بیٹی کے رشتے کو بڑی باریک بینی سے تراشا گیا ہے۔ یہ ناول بہت سے مسائل پر روشنی ڈالتا ہے۔محبت، سیاست، پدرانہ نظام، معاشرے میں خواتین کی حالت، خواجہ سرا، پاکستان، تقسیم، فطرت سب کچھ ایک ناول میں ہے۔دہلی کی گلی جیسے عام

گھر سے سرحد پار پاکستان تک کیسے پہنچتی ہے اس کی کہانی سنسنی خیز ہے۔ پورا ناول ایک فلم کی طرح چلتی ہے۔ اس کا یو ایس پی یہ ہے کہ آپ ہر صفحے کو پلٹتے ہیں نئے تجسس کو جنم دیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ رشتوں اور جدوجہد کے باریک ریشوں سے بنے اس ناول کے بارے میں چار سطروں میں بتانا ممکن نہیں۔ دراصل آپ کو اس ناول کے ہر صفحے پر بہت سے نئے کردار ملتے ہیں۔ کبھی کبھی گھر میں پڑی بے جان چیزیں بھی زندہ ہو کر اپنی کہانی سنانے لگتی ہیں۔

اس ناول کے مرکز میں ایک اسی سالہ خاتون ہے جس کا شوہر فوت ہو چکا ہے۔ اس موت کے بعد پرانی کہانی کی عورت ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہ ڈپریشن اس قدر شدید ہے کہ وہ اپنے کمرے سے نکلنا بھی نہیں چاہتی۔ پورا خاندان مختلف طریقوں سے اس کی منتیں کر رہا ہے۔ بیٹا اپنے انداز میں اور بیٹی اپنے انداز میں التجا کرتی ہے کہ وہ کم از کم اپنے کمرے سے باہر آ جائیں۔ لیکن خاتون نے خود کو ایسے خول میں بند کر رکھا ہے کہ وہ باہر نکلنے سے ڈر رہی ہے۔ پھر ان کے الفاظ کی آواز بدلتی ہے، اب وہ نہیں نکلیں گی۔ عورت جاگ اٹھیں۔ بالکل نیا نیا بچپن، نئی نئی جوانی، ممنوعات اور سماجی ممنوعات سے پاک، نئے رشتوں اور نئے تناظر میں بالکل آزاد۔ ہر عام عورت میں ایک غیر معمولی عورت کی عظیم داستان چھپی ہوئی ہے، ریت کی سمادھی، پھر مشترکہ خاندان کی حالت، ملک کی حالت اور عام انسانی تقدیر کی واحد نمائندگی۔ اور ایک لافانی محبت کی کہانی اور روزی جیسا ناقابل فراموش کردار۔ اس ناول میں کہانی لکھنے میں ایک نئی باریکیت ہے۔ اس کی کہانی، اس کی تاریخ، اس کی حساسیت، اس کا بیانیہ، سب کچھ منفرد انداز میں سامنے آتا ہے۔ ہماری حدود اور خاندانی حدود کو پار کرنا۔ یہاں کا مانوس بھی بالکل منفرد اور نیا ہے۔ ان کی دنیا اتنی ہی جادوئی ہے جتنی جانی پہچانی ہے، دونوں کے درمیان فرق کو دھندلا کر رہی ہے۔ یہاں بھی وقت اپنے تسلسل میں آتا ہے۔ ہر وجود ماضی کی ہستیوں کو گلے لگاتا ہے اور ہر لمحہ صدیوں سے سو رہا ہے۔ مثال کے طور پر، واہگہ بارڈر پر ہر رات ہونے والے جارحانہ ہندوستانی اور پاکستانی قوم پرست مظاہرے ''ذبح کی بھولبلیا سے واپس آنے والی آوازوں'' میں دہرائے جاتے ہیں اور وقت کا طویل سایہ مشترکہ خاندان کی روزمرہ کی زندگی تک محدود ہے۔ اور بھی حدود ہیں جو اس ناول کو منفرد بناتی ہیں، جیسے مرد اور عورت، جوان اور بوڑھے، جسم اور دماغ، محبت اور نفرت، نیند اور بیداری، مشترکہ اور جوہری خاندان۔ ہندوستان اور پاکستان، انسان اور دوسرے جانور (یہ بے وجہ نہیں ہے کہ یہ کہانی کبھی کبھی تتلی، کوے، تیتر، یا کسی قدیم سڑک یا دروازے کی آواز کو سنائی جاتی ہے) یا نثر اور شاعری میں، شکل میں دھم کے آنسو پتھروں کی بارش کے قطروں سے گرتے ہیں۔

ناول میں آپ کو رشتوں کی ایک بالکل عجیب دنیا کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اسی دوران اچانک بوڑھی عورت پاکستان جانے کا سوچتی ہے۔وہاں انہیں روزی نامی خاتون کی کچھ اشیاء حوالے کرنی ہیں۔جیسے جیسے آپ اس ناول کو پڑھیں گے،آپ محسوس کریں گے کہ یہ کیسے ایک سادہ سی عورت کی کہانی بھی ہے،کیسی سرحدوں کی کہانی بھی ہے اور کیسے انسانی رشتوں کی پیچیدگیوں کی نفسیاتی داستان بھی ہے۔یہ تاریخ کی کہانی ہے۔

رشتوں کے تانے بانے میں بُنا یہ ناول بہت سے مسائل پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ہندوستان سے پاکستان کا سفر معاشرے کی ان توقعات کو بھی ظاہر کرتا ہے جو روایتی طور پر عورت سے رکھتی ہیں۔اخلاقی پولیسنگ سے پیدا ہونے والے تنازعات، پدرانہ نظام کے خلاف اٹھنے والی نرم آواز سے سیاست کے دوغلے پن تک، ماحول کی فکر،فرقہ واریت،محبت کی آواز کے ساتھ ساتھ ہندو پاک کی سیاست بھی اس ناول میں سامنے آتی ہے۔

گیتانجلی شری کی زبان صاف ہے۔ان کے ناول میں جملے بہت مختصر ہیں۔ناول کے نامکمل جملے بھی سیاق وسباق کو پوری طرح کھلا رکھتے ہیں۔دھماسے آنسو پتھر کی طرح گرتے ہیں۔ناول میں کچھ الفاظ بھی ایسے ہیں جو جملے پر بھاری ہیں۔'برسات کی بوند' جیسے شاعرانہ جملے اس ناول کو بالکل نیا رنگ دیتے ہیں۔'ریت سمادھی' سے ایک اقتباس کا اردو ترجمہ دیکھیں:

> ''بیٹی کا نچلا ہونٹ رونے سے کانپ رہا تھا اور ماں نے اسے گود میں اٹھالیا۔پھر جو ہوا وہ یہ کہ ماں وہ ہونٹ بن گئی جو کانپ رہا تھا۔بیٹی کا سر کندھے پر رکھ کر اسے بہلانے گنگنانے لگی کی وہ جو بڑا سا ہاتھی ہے،بیٹھی ہے انتظار میں کہ بیٹی آئے، اس کی سواری کرے،اور دونوں جھوم جھوم کریں،اور پتے گپ شپ کر رہے ہیں۔
>
> اور سنو سنو کہانیاں سنا رہے ہیں۔
>
> بیٹی مسکرائی۔یہ ہوا تو ماں وہ مسکان بن گئی۔
>
> بیٹی کے رونے کی آواز آہستہ آہستہ ٹھہری ہوئی سانسوں میں بدل گئی اور ماں سسکی سے سانس ہوگئی۔
>
> بیٹی سوگئی اور ماں اسے خوابوں سے ڈھانپتی رہی۔
>
> اس وقت ایک محبت پیدا ہوئی۔ماں اپنی سانس کھوتی رہی،بیٹی کی سانس کھلکھلانے لگی اور ہاتھی کی پیٹھ خوشی سے چیخنے لگی۔''

کبھی کبھی بے جان چیزیں بھی اس ناول میں زندہ ہو جاتی ہیں۔ گیتا نجلی شری نے انہیں کئی بار کرداروں کے طور پر پیش کیا ہے۔ جب یہ بے جان کردار زندہ ہوتے ہیں اور اپنے اندرونی کشمکش کا اظہار کرتے ہیں، تو وہ کبھی پیوند کی طرح نظر نہیں آتے۔ بلکہ وہ ناول کا اٹوٹ حصہ بن جاتے ہیں۔ ناول کا ایک ایسا حصہ قابل ذکر ہے۔ جس کا اردو ترجمہ پیش ہے۔

> ''زندگی کا کیا؟ چھوٹے سے دائرے میں چلنا جانتی ہے، جیسے ایک پگڈنڈی پر جو شروع ہوئی نہیں کہ ختم۔ لیکن دیوقامت بھی جانتا ہے، جیسے پگڈنڈی سے کھلی سڑک پر نکل آئے اور بڑی سڑک سے جا ملے جو ایک ہائی وے ہو، گرینڈ ٹرنک روڈ جیسی تاریخی شاہراہ ہو۔ ان کا پگڈنڈی سے دور سے دور جڑ جانا کہانی میں نئے موڑ لاتا ہے، ٹرک ٹریکٹروں کی دہاڑ سے پگڈنڈی تھرا جاتی ہے، یا سلک روٹ سے نکلنے والا ریشمی احساس جو انہیں نرمی سے لپیٹ لیتا ہے۔ پگڈنڈی حیران ہوتی ہے کہ یہ سڑکیں کہاں سے آ رہی ہوں گی، کس وقت سے، قافلوں سے، سرحدوں سے۔ اور اتنی مختلف زندگیوں کو عبور کرنے کے بعد میں کہاں سے آیا ہوں۔ کیا میں اب بھی وہی پگڈنڈی ہوں، یا اس کے بھی پہلے کی تھوڑا سا روش ہوں؟ پر یہ سوال کون پوچھے گا، اب، ابھی کسے خبر؟

ناول 'ریت سمادھی' میں کہانی جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس بوڑھی عورت (اماں) کا نام چندر پربھا ہے۔ اصل کہانی اس کے شوہر کی موت کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اماں نے چارپائی پکڑ لی۔ بیٹا، بہو، پوتا، پوتی سب اپنے اپنے طریقے سے کوشش کرتے ہیں، لیکن اماں ہلتی نہیں۔ ایک دن اماں اپنی چھڑی کے سہارے گھر سے نکلتی ہیں۔ خبر شروع ہوئی تو اماں تھانے میں مل گئیں۔ کچھ دن گھر میں رہی، پھر بیٹی کے گھر چلی گئی۔ بیٹی کی شادی نہیں ہوئی۔ یہیں سے کہانی میں موڑ آتا ہے۔ اماں ایک ٹرانس جینڈر روزی سے ملتی ہیں۔ روزی اماں کے میک اوور میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ لباس اور بول چال بالکل بدل جاتی ہے۔ چارپائی پر لیٹی اماں میں نئی توانائی آ جاتی ہے۔ کہانی اپنے تال میں جاری ہے۔ پھر اماں اپنی بیٹی کے ساتھ پاکستان چلی گئیں۔ یہ ماضی کی کہانی کی جڑ ہے جس پر شروع میں بحث کی گئی۔ بیٹا، بہو، پوتا سب دل و جان سے مانتے ہیں، لیکن اماں پاکستان کیوں گئیں، کوئی نہیں جانتا۔ جیسے جیسے ناول کی کہانی آگے بڑھتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اماں کی پہلی محبت پاکستان میں تھی۔ چندر پربھا دیوی ہندوستان کی تقسیم

سے پہلے پاکستانی علاقے میں ایک خیراتی ادارے میں تھی۔ان کی شادی انور سے ہوئی تھی۔جب ملک تقسیم ہوا تو وہ جلد بازی میں الگ ہوگئیں اور انہیں ہندوستان آنا پڑا۔ پاکستان کی عطیہ یہاں چندر پربھا بن گئی۔ چندر پربھا نے یہاں شادی کی۔ یہاں تک کہ کہانی نے مجھے سوچنے پر مجبور کردیا۔ناول کے کچھ صفحات بعض اوقات بھاری ہونے لگتے ہیں۔قیاس آرائیوں کا دور شروع ہوتا ہے کہ اماں کی اس عمر میں پاکستان جانے کی کیا وجہ ہے؟ کبھی ہنسی تو کبھی سنجیدہ قسطیں یہاں سے سوچنے پر مجبور کردیتی ہیں۔کیا آپ انور سے ملیں؟ بڑا سوال ہے۔اس میں جواب مل جائے تو ناول کا آدھا مزہ ختم ہوجائے گا۔ذہن میں ایک بحث شروع ہوجاتی ہے کہ یہ سرحدیں کیوں ہیں؟ ایک جگہ اماں بھی کہتی ہیں، کیا آپ جانتے ہیں کہ سرحد کیا ہے؟ وجود کا دائرہ ہے۔کسی نہ کسی شخصیت کا اپنا اثر ہوتا ہے۔اماں کی باتیں اسے یہاں سے جذباتی کردیتی ہیں۔

ادب کی تخلیق میں زبان ایک آلہ ہے، اظہار کا ذریعہ ہے۔اسے استعمال کرنے کا ایک فن ہے اور اسے مختلف طریقے سے استعمال کرنے کا ایک الگ ہنر ہے۔زبان کی مٹھاس، میٹھا بول، الفاظ کہنے کا ہنر، اس کی تلاوت میں نئی آواز ایجاد کرنے کا لطف، بلند آواز سے بولنے کی موسیقی۔پھنشور ناتھ رینو، راہی معصوم رضا، قرۃ العین حیدر کے ساتھ کتنی بار ایسا ہوا ہے کہ وہ اسے روکے اور بلند آواز میں پڑھے اور اس کی موسیقی میں خوش ہوں۔'ریت سمادھی' کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ بہت سے الفاظ ہیں جو گیتانجلی شری نے اس طرح استعمال کیے، اتنی آسانی کے ساتھ، جیسے پرانے دنوں کو بچالیا، جیسے ان کے استعمال سے، کوئی آنگن، کوئی میٹھا، کہیں پرانے نیم کے پتے ریچھ سے بھر جائیں، کوئی پرانا آباد گھر پھر سے خوش ہوجائے۔اس نئے چمکتے بڑے شہر کی عجیب وغریب کیفیت کو اڑا دینا چاہیے۔اس کی زبان میں روانی ہے۔اس کے جملے چھوٹے ہوجاتے ہیں اور خوبصورت قہقہوں میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھومتے ہیں۔اس کی گردش میں تازگی ہے، معصومیت ہے۔اس کے الفاظ بہت مختلف امیج بناتے ہیں اور کچھ ایسے بہاؤ کے ساتھ تخلیق کیے گئے ہیں کہ ہر چیز بے ساختہ، بغیر جلد بازی کے، ایک معصوم سی معصومیت کے ساتھ، جیسے بچے کے ہاتھ میں چڑیا ہے۔ گیتانجلی شری کا یہ ناول نہ صرف ہندو پاک سرحد پار کرتا ہے بلکہ تحریر کی ہر حد کو بھی توڑ دیتا ہے۔الفاظ جملے کی تشکیل کے بغیر اتنے عجائبات کرسکتے ہیں، جو آپ اس ناول میں دیکھتے ہیں۔کب کہانی سے نظم میں اور کب نظم سے گیت کی طرف، پتہ نہیں چلتا۔تاہم بعض اوقات یہ تھوڑا سا بوریت بھی پیدا کرتا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ چیزیں زبردستی کھینچی جارہی ہیں۔لیکن اگلے چند صفحات پڑھنے کے بعد کہانی ایک نیا موڑ لیتی ہے اور قاری پھر

سے کہانی میں مگن ہو جاتا ہے اور کہانی میں آگے کیا ہوگا کہ تجسس ہر دھیما پن کو ختم کر دیتا ہے۔ یہ اس زبان کا کمال ہے کہ پہلے مطالعہ میں کئی حصے پانی کی طرح پھسل جاتے ہیں اور اس کے تاثرات سطح پر پھولوں کی طرح تیرتے ہیں۔ لیکن باب کے شروع میں تجرید کی دنیا بنانے والے بعض حصوں کی بناوٹ ایسی ہے کہ تمہید روک کر کی جائے، کہ رکنے میں غرق ہونے کا احساس مسلسل ہو۔ عام طور پر ہندی تحریریں کچھ پرانے دھاگے کو برقرار رکھتی ہیں۔ غیر ملکی تحریروں کے برعکس، ایک جمود کا شکار دنیا بار بار دہراتی رہتی ہے۔ لیکن اس ناول میں کچھ نئے دستکاری یا بنائی کے کھیل ہیں۔ توقع ہے کہ اگر کوئی سماجی تناظر، کوئی کہاوت، کوئی اخلاقی پیغام نہ ہو تو اس تحریر کو غیر سنجیدہ کے زمرے میں رکھا جائے۔ گاؤں اور غریب کی کہانی جیسی کوئی کہانی نہیں، شعور اور انقلاب کی کہانی ہے۔ جس طرح کوئی ادیب ادیب نہیں بنا، کوئی اخلاقی مبلغ بن گیا، کوئی سماجی کارکن بن گیا۔

مصنفہ یہ سب کچھ ہے لیکن اس سے مختلف بھی ہے۔ یہ جتنا سماج میں پیوست ہوتا ہے، اتنا ہی الگ ہوتا ہے۔ وہ ایک دیکھنے والا ہے، تیسرا جو پہلے کو دیکھ کر دوسرے کو دیکھ رہا ہے۔ اس کے باوجود اس کا سیاق و سباق نہ صرف خارجی ہے بلکہ اندر کی دنیا بھی ہے۔ مجھے ہندی کی بہت سی کتابیں یاد آ رہی ہیں جو اس اندرونی دنیا کی عمدہ کاریگری کے لیے ایک سانس کے بعد سانس کھولتی ہیں، ایک تاخیری الاپ کی طرح، جو سارا دن چلتی ہے، رات بھر چلتی ہے، سو صفحات پر چلتی ہے یا عمر بھر۔ نرمل ورما، کرشنا سوبتی، کرشنا بلدیو وید، جیوتسنا ملن، قرۃ العین حیدر، ان دنوں گویا یہ گوہر کہیں غائب ہو گیا تھا۔ 'ریت سمادھی' سے پھر وہی احساس جاگتا ہے۔ زبان و بیان کی چاشنی ملتی ہے جو جس کی مٹھاس کچھ عرصے سے غائب ہو گئی تھی۔ پھر گیتا نجلی شری کی تحریروں میں وہی ذائقہ، وہی جمود ہے کوئی ڈرامہ، کوئی دکھاوا، سچائی کی منافقت نہیں۔

گیتا نجلی شری کا یہ ناول اس لحاظ سے غیر کہانی ہے۔ جیسا کہ اس نے فیصلہ کیا کہ اس ناول میں وہ روایتی عناصر نہیں ہوں گے۔ پھر سارے بندھن توڑ کر اس نے یوں لکھا جیسے ذہن سوچتا ہے، اُڑ کر اِدھر سے اُدھر، پھر کہاں کہاں۔ شروع شروع میں ایسا لگتا ہے کہ بے ساختہ بہاؤ ہے، بغیر کسی تیاری کے، پھر دھیرے دھیرے یہ بات پختہ ہو جاتی ہے کہ اس سیمل کے بیج سے نکلنے والے جنگلی بہاؤ میں بھی ایک ناہموار اور باریک قسم کا کنٹرول ہے۔ اس کے پیچھے ایک ایسا ریاض ہے جو اپنی سراسر سادگی میں اس کے پیچھے کام کو پوشیدہ بنا دیتا ہے۔ تاہم، گیتا نجلی شری جو کچھ نہیں کہتی اور نہ سوچتی ہے یا جو کچھ اس نے نہیں لکھا، ان سب کی ایک کہانی بھی ہے جو کہ بہت اہم ہے۔ تصویر میں جو نہیں دکھایا گیا اس کی اہمیت کا احساس بھی ایک منظم طریقے سے ٹھوس انداز میں ابھرتا ہے۔

پروفیسر محمد یحییٰ صبا
Professor, Department of Urdu, Kirorimal College, Delhi

تصوف کے شاعر: خواجہ میر دردؔ

ملخص

خواجہ میر دردؔ کو اردو میں صوفیانہ شاعری کا امام کہا جاتا ہے۔ دردؔ اور تصوف لازم وملزوم بن کر رہ گئے ہیں۔ یقیناً دردؔ کے کلام میں تصوف کے مسائل اور صوفیانہ حسّیت کے حامل اشعار کی کثرت ہے لیکن انہیں محض ایک صوفی شاعر کہنا ان کی شاعری کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ دردؔ کی شاعری بنیادی طور پر عشقیہ شاعری ہے ان کا عشق مجازی بھی ہے، حقیقی بھی اور ایسا بھی جہاں عشق ومجاز کی سرحدیں باقی نہیں رہتیں لیکن ان تینوں طرح کے اشعار میں احساس کی صداقت واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اسی لیے ان کے کلام میں تاثیر ہے جو صناعی کے شوقین شعراء کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ دردؔ نے خود کہا ہے ''فقیر نے کبھی شعر آورد سے موزوں نہیں کیا اور نہ کبھی اس میں مستغرق ہوا۔ کبھی کسی کی مدح نہیں کی نہ ہجو لکھی اور فرمائش سے شعر نہیں کہا۔ دردؔ کے عشق میں بےچینی نہیں بلکہ ایک طرح کی طمانیت قلب، سکون اور پاکیزگی ہے۔ دردؔ کے کلام میں عشق وعقل، جبر واختیار، خلوت اور انجمن، سفر در سفر، بےثباتی وبےاعتباری، بقا اور فنا، مکان ولامکاں، وحدت وکثرت، جزو وکل توکل اور فقر کے مضامین کثرت سے ملتے ہیں۔ مجموعی طور پر دردؔ کی شاعری دل اور روح کو متاثر کرتی ہے۔ جذباتیت اور شاعرانہ استادی کا اظہار ان کا شعار نہیں، دردؔ موسیقی کے ماہر تھے۔ ان کے کلام میں بھی موسیقیت ہے۔ دردؔ بھی شعر کہتے تھے جب شعر خود کو ان کی زبان سے کہلوالے۔ اس لیے ان کا کلام بہت مختصر ہے۔

ماہیتوں کو روشن کرتا ہے نور تیر — اعیاں ہیں مظاہر، ظہور تیرا
نہیں مذکور شایاں دردؔ ہرگز اپنی مجلس میں — کبھو کچھ ذکر آیا بھی تو ابراہیم ادھم کا

کلیدی الفاظ:۔ درد، تصوف، صوفیانہ، عشق حقیقی، غزل اور رباعی

اٹھارہویں صدی (1720-1786) کی شاعری کی دیوار جن چار شعرا پر کھڑی

تھی ان کا کلام صوفیانہ ہے ان کے کلام میں پاکیزگی اور جذبات کے خلوص کی بہتات ہے اٹھارہویں صدی عیسوی کے تمام شعراء وادبأ اور تذکرہ نگاروں نے خواجہ میر درد کی بلیغ شعری خدمات کوفوقیت دی ہے۔خواجہ میر درد کا نام آتے ہی ہمارے ذہن میں ایک ایسی منفرد شخصیت ابھرتی ہے جس کے درمیان تقدس، پاگیزگی اور قادرسنجیدگی کا ایک زبردست ہالہ ہے اس شخصیت میں اتنا توکل صبروضبط اور زندگی میں کچھ کر دکھانے کا حوصلہ تھا کہ وہ زہرہ گداز حالات سے بھی ہنستے کھلتے گزر گئے۔درد کا شمار دوراول کے اردو شاعری کے چار ستونوں میں ہوتا ہے۔مرزا مظہر، سوداؔ، میرؔ اور دردؔ۔دردؔ کی شاعرانہ صلاحیت اور صوفیانہ عظمت کا زمانہ معترف رہا ہے۔ان کے فکر وفن کا ایک گوشہ ان کی شخصیت کے نور سے روشن ہے ان کے کلام بر بحث کرتے ہوئے نئے اور پرانے نقادوں نے یکساں طور پر ان کے کلام کی قدر کی ہے۔امیر مینائی کو ان کے کلام میں بسی ہوئی تجلیوں کا گمان ہوا محمد حسین آزاد کے مطابق میرؔ درد نے اپنے کلام میں تلواروں کی آب بھر دی ہے۔

خواجہ مردؔ اردو کے ان قابل احترام شاعروں میں ہیں جن کا کلام سائستگی ونفاست کیف واثر اور فنی رکھ رکھاؤ کے اعتبار سے ایک معیاری چیز ہے۔اردو کے عام شعراء کے برخلاف وہ ایک پیشہ ور شاعر نہیں تھے۔انشاء، مصحفی، جرأتؔ اور شاہ نصیر کی طرح ان کے مجموعۂ کلام میں کوئی طویل غزل یا دو غزلے اور سہ غزلے نہیں ملیں گے۔استادی اور کرتب دکھانے کے لیے انہوں نے سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کرنے یا الف سے لے کری تک تمام ردیفوں میں غزلیں کہنے کا التزام کبھی نہیں کیا۔ان کے لب ولہجے میں میر کی سادگی اور گھلاوٹ ہے لیکن ان کی شخصیت میں میرؔ کی نسبت اعتدال اور توازن ہے۔میرؔ کے یہاں شکست خوردگی اور غموں کی شدید جلن ہے۔ان کی آواز میں کبھی کبھی آجاتی ہے لیکن خواجہ میر دردؔ نے غموں کو ہضم کر کے اسے گوارا بنالیا تھا ان کے یہاں ایک حسین سی کسک ہے جو ہم پر خوش گوار اثر چھوڑتی ہے۔تصوف نے ان کے مزاج میں ترتیب وتہذیب پیدا کر دی تھی جس کی وجہ سے وہ ان شاعرانہ بے اعتدالیوں سے بچ گئے۔جو میرؔ کے کلیات کو ناہموار بنادیتی ہیں۔اور جن کی بناء پر ''بلندیوں بغایت بلند اور بغایت پست'' کا فقرہ ان کے لیے وضع کیا گیا۔

اپنی صوفیانہ شاعری کے علاوہ خواجہ میر دردؔ اپنی عشقیہ شاعری میں بھی اردو کے غزل گو شعراء میں

منفرد ہیں۔ان کی اس حیثیت میں سوائے میرؔ کے ان کا اور کوئی حریف نہیں۔لیکن یہ عجیب بات ہے کہ عشقیہ شاعری کے سلسلے میں ان کا تذکرہ کبھی نہیں آیا جن شعراء نے عشق ومحبت کے صرف مضمون باندھے ہیں۔ان کے اشعار کو طرح طرح کے معنی پہنانے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن جن شاعر کے عشقیہ اشعار تاثیر سے لبریز ہیں ان پر کسی کی نگاہ نہیں جاتی۔اردو کے عام غزل گو شعراء کے یہاں عشق ومحبت کے مضامین بھرے پڑے ہیں۔لیکن ان کی حیثیت محض لطف بیان کی ہے۔ سچی چاہت اور اس کا کرب اور عشق کی شدید کیفیات سے ان کے اشعار خالی ہے۔اسی لیے قدیم تذکروں میں ان کے موضوع کو چھوڑ کر ان کے طرز بیان اور فنی خوبیوں کو مختصراً زیر بحث لایا گیا ہے۔ بعد میں جب ہمارے تذکرہ نگار ومورخ تفصیلات میں جانے لگے تو ہر شاعر کے ساتھ بعض باتیں منسوب کردی گئیں مثلاً میر درد وغم کے شاعر ہیں اور خواجہ میر دردؔ تصوف وعرفان کے یہ روایت کچھ ایسی چلی کہ آنے والے لوگوں نے بھی اکثر وبیشتر انہیں بیانات کو جوں کا توں اپنالیا ہے۔محمد حسین آزادؔ ''آب حیات'' میں خواجہ میر دردؔ کے تغزل کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''انہوں نے میر کی غزلوں پر جو غزلیں لکھی ہیں وہ میرؔ کسی طرح کم نہیں ہیں اور چھوٹی بحروں میں انہوں نے جو غزلیں لکھی ہیں ان میں تلوار کی آبداری اور نشتریت ہے،،لیکن ان کے عاشقانہ موضوعات کا تذکرہ نہیں کرتے بلکہ ان کے تصوف پر زور دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ''تصوف جیسا انہوں نے کہا اردو میں آج تک کسی سے نہیں ہوا'' دور حاضر کے تاریخ نگار بھی اس حد سے آگے نہیں بڑھتے موجودہ زمانے کی دو مقبول عام تاریخوں میں خواجہ میر دردؔ کے بارے میں یہی تصور ملتا ہے۔

ایک ناقد نے درد کو صوفیانہ شاعری کا سرتاج قرار دیا ہے غرض یہ کہ خواجہ میر دردؔ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف سبھی نے کیا ہے ان کے کلام میں دل آویزی، بلند خیالی اثر انگیزی، سادگی، تقدس اور طہارت رچی بسی ہوا ہے۔ درد کی شاعری کا محور محبت ہے وہ محبت حقیقی بھی ہے اور مجازی بھی، ذات خداوندی وحدت الوجود، انسانی عظمت اور بقاء کے مضامین محبت حقیقی کے مظاہر ہیں۔ دردؔ کے کلام میں تحمل اور فکر جمیل کی وجہ سے دل کشی اور دل آویزی تو ہے ہی ان کے مخصوص انداز بیان کے کومل اور نرم لب ولہجے نے ان کے فن میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ بقول رام بابو سکسینہ تصوف میں ان سے بہتر کسی نے نہیں کہا۔عرفان وتصوف کے پیچیدہ اور دشوار گذار مضامین کو انھوں نے بڑی خوبصورتی اور صفائی سے باندھا اور پرویا ہے ان کی غزلوں میں زبان کی سادگی میرؔ کے کلام کی یاد دلاتی ہے۔لیکن

تصوف کی چاشنی اور درد واثر وکلام میر سے بڑھ کر ہے بلکہ یوں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ یہی اوصاف درد کے کلام کا جوہر اعظم ہے۔ درد نے دنیاوی آلودگی سے دامن کو چھڑا کر اپنے کلام میں تصوف اور اخلاق کی چاشنی بھر دی ہے، جس کی وجہ سے ان کا کلام آسمان کی بلندی پر پرواز کر رہا ہے۔

تنقید کی دنیا میں بہت سی ایسی باتیں چل پڑتی ہیں اور زبان زد خاص عوام ہو جاتی ہیں جن کا فی الحقیقت کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یہ بات شعرا کے کلام پر لکھی گئی تنقیدوں کے بارے میں زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ بہت سی ایسی رائیں اور فیصلے اب اس طرح مستحکم ہو چکے ہیں کہ ان پر قلم اٹھانا یا ان کی مخالفت میں کچھ لکھنا ذرا مشکل ہی ہے۔ ایسی مانی ہوئی باتیں مثلاً میرؔ کے بہتر نشتر، دردؔ کا تصوف، غالبؔ کی فلسفیت فانی کی قنوطیت وغیرہ ہماری درسی اور تنقید کتابوں کا جز کا جز بن چکی ہیں پھر بھی توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری کے مصداق ہمارے عہد میں ایسی تنقیدی کوششیں کبھی کبھی ہوئیں جن میں اس طرح کے تنقیدی مفروضات کی چھان ہیں اور محاکمہ کر کے ان کی تردید بھی کی گئی۔

خواجہ میر دردؔ کا دور افراتفری اضطراب اور کشمکش، شور و ہنگامہ کا دور تھا۔ ایسے توڑ پھوڑ اور شکست و ریخت کا اثر ان کی شاعری سے چھلکتا ہوا نظر آتا ہے ان کے یہاں صبر و استقلال توکل و استغنا موجود ہے تصوف ان کو ورثے میں ملا تھا۔ ہستی تصوف کو انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا انھوں نے اس دنیا کی بے ثباتی اور کم مائی یگی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس دنیا کی حقیقت ''نقش بر آب سے زیادہ نہیں'' اسی طرح ان کے خیال سے متعلق شاعر مشرق علامہ اقبال کا ایک شعر ہے ۔

اول و آخر فنا باطن و ظاہر فنا نقش کہن ہو تو ہے منزل آخر فنا

اس کے ساتھ ہی دردؔ نے انسانیت کے درد و کرب کو محسوس کرتے ہوئے کائنات کے ہر ذرے کے غم کو اپنایا ہے۔ مثال ملاحظہ فرمائیں۔ جس میں شکست دل کی آواز سنائی دیتی ہے ۔

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا کہ نہ ملنے میں رو دیا ہوگا
دل زمانہ کے ہاتھ سے سالم کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا

اتنا ہی نہیں کہ شاعر نے ایسی زندگی کو پیچ زندگی سے مشابہت دی ہے کہ یہاں پر انسان سوائے تہمت و الزام کے کچھ حاصل نہیں کر سکتا ہے یہ گلزار ہستی فکر و فریب کا خوش نما و خوبصورت جال ہوگا جہاں انسان ہمیشہ فریب پیہم میں مبتلا رہتا ہے۔ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے کس لیے آئے تھے ہم کیا کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

خواجہ میر درد کو صوفیانہ شاعری کا سرتاج کہا جاتا ہے عرفان و تصوف کی وجہ سے ان کے کلام میں تقدس و پاکیزگی کی صفات پیدا ہوگی ہے تصوف ان کے رگ و پئے میں رچ بس گیا ہے ان کے عمل اور ان کے شعریات میں صوفیانہ رنگ سرایت کر گیا تھا انہوں نے کائنات کے ذرے ذرے میں باری تعالیٰ کا وجود پایا اور اسے شعر میں پیش کر دیا۔

جگ میں آ کر ادھر ادھر دیکھا تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

اتنا ہی نہیں شاعر نے دیر و حرم شیخ و برہمن سب کو خالق مطلق کے لو۔ سے روشن پایا اور انسان کے جان و دل کو کثرت میں وحدت کا واحد مسکن تصور کیا ہے انسان کے دل کے علاوہ ارض و سما میں بھی ایسی وسعت نہیں جہاں ذات باری کی قدرت اور وحدت ایک ساتھ ایک آسمان تلے انسانوں کے ایک بیکراں سمندر میں جس کی گہرائی کا اندازہ لگانا دشوار ہے بڑے آرام سے جلوہ فگن ہے ان کے اشعار جس کا ایک ایک لفظ ذات باری کے اوصاف اور انسانی عظمت کی گواہی دیتا ہے۔

ارض و سماء کہاں تیری وسعت کو پا سکے میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

کبھی کبھی میر درد مجاز کی طرف بھی رجوع کرتے ہیں لیکن یہاں بھی ان کی رجعت حقیقت ہی کی طرف ہے۔ جہاں انہوں نے مجازی عشق کا تصور پیش کیا ہے وہاں بھی ان کا معشوق حقیقی ہی ہے۔ اسی پاکیزہ نیت اور معتبر مقصد کی وجہ سے ان کا کلام اعلیٰ مرتبت ہو گیا ہے۔

درد نے اس طرح عشق حقیقی تصوف اور روحانیات کی چاشنی سے اپنے کلام میں چار چاند لگا دیئے ہیں درج ذیل شعر کو دیکھیے۔

مسکرایا خوشی سے وہ جس دم باغ میں کب کھلی کلی ایسی
جب نظر سے بہار گزرے ہے جی پہ رفتار یار گزرے ہے

درد کے کلام میں صوفیانہ رنگ زیادہ غالب ہے اس لیے ان کی شاعری میں صوفیانہ فکر کی جھلک عام ملتی ہے۔ درد کی غزلوں میں منفرد الفاظ کا موزوں ترین استعمال ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ حسن و رنگ اور خوشبو سے غزل کی فضا میں جادو جگا رہا ہے بیشتر اشعار میں غنائی آہنگ

کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔تشبیہات اور استعارات کے استعمال میں درد کا احساس جمال بہت صاف ستھرا اور نکھرا ہوا نظر آتا ہے ان تشبیہوں میں گرمی عشق روشنی خلوص اور غموں کی دھیمی آنچ ہے اسی نے شعلہ و شبنم کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

خواجہ میر درد نے چھوٹی بحروں اور مترنم الفاظ کے استعمال سے آرٹ کی بلندیوں کو چھولیا ہے۔اسی لیے محمد حسین آزاد نے کہا تھا کہ خصوصاً چھوٹی بحروں میں جو غزلیں لکھتے ہیں گویا تلواروں کی آبداری نشتروں میں بھر دیتے ہیں۔

انھوں نے غزلوں کا ایک مختصر سا دیوان چھوڑا ہے مگر معیار کے اعتبار سے بڑے بڑے دیوانوں پر بھاری ہے۔وہ درویش مزاج انسان تھے اور صوفی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔اسی کا اثر ہے کہ ان کا صوفیانہ کلام خود ان کے دل کی واردات ہے یہی وجہ ہے کہ اس میں بے پناہ اثر ہے۔بعض لوگوں نے ان کی شاعری میں موجود سلاست اور سادگی کو میرؔ پر فوقیت دی ہے۔چھوٹی بحر کی غزلوں میں موجود آسان اور عام فہم الفاظ ان کی شاعری کا سرمایہ ہیں۔نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

جگ میں آ کر ادھر ادھر دیکھا　　تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور　　شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

وائے نادانی کہ وقت مرگ پہ ثابت ہوا　　خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

عہد میر کے شعراء میں خواجہ میر دردؔ کا بھی اعلیٰ مرتبہ ہے ان کے مطابق عشق کے ذریعہ حقیقت مطلق تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے ان کے لیے تمام کائنات آئینہ وحدت ہے یعنی وہ تصوف کے منطق اور وحدۃ الوجود کے معتقد ہیں اور اسی کے عرفان سے ان کے یہاں انسانی عظمت کے چراغ روشن ہوتے ہیں۔

''انسان کا تصور بھی درد کے یہاں اتنا بلند ہے اور اس میں الوہیت کی وہ شان ہے کہ انسان کی یہ تصویر ان کے علاوہ اور کسی اردو شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی''

اسی رنگ میں ڈوبے ان کے اشعار دل میں تصوف کا جذبہ پیدا کرتے ہیں وہ انسان کے اندر بھی مالک حقیقی کا دیدار کراتے ہیں۔یہاں تک کہ بتوں میں بھی انھیں اپنے مالک حقیقی کا ہی تصور نظر آتا ہے۔

بیگانہ گر نظر پڑے تو آشنا کو دیکھ　　بندہ گر آوے سامنے تو بھی خدا کو دیکھ

دردؔ نے تصوف کے مختلف مسائل اور کیفیات کو غزل کی پیرائے میں پیش کیا ہے۔اسی انداز نے ان کے یہاں غم کی تلخی کو کم کر کے اس کے اندر سرور پیدا کر دیا ہے۔مثلاً

اس نے کیا تھا یاد مجھے بھول کر کہیں پاتا نہیں ہوں تب سے میں اپنی خبر کہیں

درد کی غزلوں میں وہ مجازی کیفیات اور عشق کی ترجمانی نام کو بھی نہیں ہے۔وہ تو عشق حقیقی کے شاعر ہیں لیکن اس عشق حقیقی کی متنوع کیفیات کو جس انداز میں انھوں نے محسوس کیا ہے اور پھر جس طرح اس کی ترجمانی کی ہے وہ اردو غزل کی روایت میں ایک بہت بڑا اضافہ ہے۔دردؔ تصوف کے شاعر ہیں اور تصوف مسائل کو پیش کرتے ہوئے وہ زندگی کی فضاوں میں اتنا اونچا اڑتے ہیں کہ اپنے آپ کو کہیں کہیں نظروں سے اوجھل کر دیتے ہیں اس لیے ایک قسم کی ماورائیت بھی ان کے یہاں پیدا ہوگئی ہے لیکن ان کے اس انداز میں ایک رفعت اور بلندی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔درد کی غزلوں میں سارا کھیل تخیل کا ہے اور تخیل کی بلند پروازی نے ایک ایسی رنگین اور پرکار فضا ان کی غزلوں میں پیدا کر دی ہے جو بڑی دلکش اور دلآویز ہے اسی فضا نے درد کی غزل کو ایک حسین نگارخانہ بنا دیا ہے جذباتی خیالات کا ایسا حسین مرقع اردو شاعری میں اور کہیں نہیں مل سکتا ہے اصغر کی غزلیں انھیں مرقعوں کا ایک مجموعہ ہیں درد کے یہاں موضوعات کا تنوع نہیں ہے صرف تصوف کی کیفیات ہیں جو کہیں فلسفے کی حدود میں داخل ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں لیکن ان کی تخیل پرستی اور روحانیت انہیں فلسفی نہیں بننے دیتی اس لیے یہاں موضوع کی یکسانیت ضروری ہے لیکن تخیل کی نگوں کاری نے اس کمیابی کو ایسا حسین بنا دیا ہے کہ ان کی شاعری ایک چمنستان نظر آتی ہے۔

''فلسفہ اور تصوف درد کی شاعری میں بڑی رچی ہوئی صورت میں موجود ہے درد نے اپنی غزلوں میں صرف تصوف کے روایتی تصور کو پیش نظر نہیں رکھا ہے انھوں نے اس سلسلہ میں نئی باتیں بھی کی ہیں۔درد نے تصوف کے تمام مسائل کو موضوع بنا دیا ہے لیکن ان مسائل کو انھوں نے نئے زاویۂ نظر ان کے مسائل کو صرف تصوف کو بڑی اہمیت دیتی ہے اس معرفت کا حاصل کرنا زندگی کی معراج ہے اور یہ معراج اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب فرد کے پاس نصف العلیین ہو۔فرد اور اس کے اعمال درد کے تغزل میں بہت اہمیت رکھتے ہیں درد نے اس فرد کا بہت بلند تصور پیش کیا ہے۔

''درد تو تصوف میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان کا مخصوص موضوع حیات کائنات

کے مسائل ہیں جن پر ان کی نظر بہت گہری پڑتی ہے لیکن انسانی حسن اور اس کی اہمیت کا احساس اس کے باوجود ان کے یہاں بہت شدید نظر آتا ہے۔ اس سے ایک والہانہ وابستگی اور پھر اس سلسلے میں جو تنوع کیفیات طاری ہوسکتی ہے اور ان سب کی ترجمانی انھوں نے بڑی خوبی سے کی ہے'' یہ بھی درد کی بڑائی ہے کہ انھوں نے تصوف کو تصوف ہی رہنے دیا ہے اسے فلسفہ نہیں بنایا ہے یہی وجہ ہے کہ ذاتی شعور ان کی غزلوں میں نہیں ملتا ہے وہ تو جذب وشوق کے شاعر ہیں اور اسی جذب وشوق نے ان کی غزلوں کو آسمان پر پہنچا دیا ہے ان غزلوں نے آسمان سے ستارے توڑے ہیں اور ان ستاروں سے غزل کی روایت کی محفل کو سجایا ہے۔

یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ برق، آتش، خورشید، شعلہ وغیرہ اردو فارسی شاعری کے عام الفاظ ہیں۔ کیا دردؔ اور غالبؔ کے یہاں ان کا استعمال رسمی نہیں قرار دیا جا سکتا؟ میں کہوں گا کہ شعر کا لہجہ اور اٹھان ہی بتا دیتی ہے کہ یہ رسمی اور روایتی ہے یا اصلی اور ذاتی۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ غالبؔ اور دردؔ کے یہاں اکثر و بیشتر جس کیفیت کا اظہار آتش اور خورشید اور شعلہ جیسے الفاظ سے کیا گیا ہے اس کے اظہار کے لیے اور بھی بہت سے روایتی اسالیب بیان اور استعارے موجود ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ دونوں نے بار بار انہیں کا انتخاب کیا ہے؟ زیادہ تر اشعار میں یہ صورت اور پیکر لائے گئے ہیں بلکہ آئے ہوئے، معلوم ہوتے ہیں اور کسی شدید جبلی ترجیح Instinctive Preference کی طرف اشارہ کرتے ہیں ورنہ چھوٹے سے دیوان میں ان کی مسلسل تکرار کیا معنی رکھتی ہے؟ اور یہ پیکر کسی اور بڑے شاعر مثلاً میر کے کلام میں اس کثرت سے کیوں نہیں پائے جاتے؟ میں سمجھتا ہوں کہ دردؔ اور غالبؔ دونوں کے تخیل میں جو علویت اور مزاج میں جو سوز و بے چینی کی خلش تھی۔ اس نے غیر شعوری طور پر خود کو ان استعاروں کے انتخاب کی صورت میں ظاہر کیا۔ ان دو بڑے شعراء کی مزاجی ہم آہنگی کی طرف اس سے زیادہ واضح اور روشن اشارہ کیا ہوسکتا ہے۔

مرزا غالبؔ اور میر دردؔ دونوں کی ذہنی ساخت کو ہم مجموعی طور پر عملی رومانیت Intellectual Romanticism کا نام دے سکتے ہیں کہ جب ہم اردو شعراء کی جگہیں متعین کریں تو دردؔ کو غالبؔ اور اقبال کی ضمن میں رکھیں، میر اور آتش کے ساتھ نہیں۔ اس تقسیم سے نہ دردؔ کی شاعرانہ حیثیت میں کوئی اضافہ ہوتا ہے نہ آتش کی اہمیت میں کوئی تخفیف یہ تقسیمیں سمجھنے اور

سمجھانے کی آسانی کے لیے ہیں، بڑے اور چھوٹے کی تخصیص کے لیے نہیں۔

میر درد کی زبان وہی ہے جو میر و سودا کی زبان ہے۔ جیسے میر و سودا کی زبان کے بہت سے الفاظ آج متروک ہو گئے یا بدل گئے، وہی صورت درد کی زبان کے ساتھ ہے، مثلاً درد کے ہاں کبھو، تئیں، ٹک نت ہیں گے، تجھ، سوا، ان نے دیکھوں ہوں، انہوں کی، ہوجیو، لے ڈوبیاں، پائیاں ہیں وغیرہ الفاظ اور فعل و ضمیر ملتے ہیں، ان چند بدلی ہوئی یا متروک صورتوں میں کے علاوہ میر درد کی زبان ویسی ہی صاف و شستہ زبان ہے جو آج بولی جاتی ہے درد نے محاورہ و روزمرہ کا استعمال کثرت سے کیا ہے لیکن انہوں نے میر کی طرح خالص عوام کی زبان کو استعمال نہیں کیا بلکہ ایسے الفاظ اور محاورے روزمرہ استعمال کیے جو عوام و خواص میں یکساں طور پر رائج تھے۔ اسی لیے ان کی زبان یکساں و ہموار ہے۔

میر درد نے بہت کم کلام چھوڑا ہے اور وہ بھی کم و بیش تمام تر صنف غزل میں ہے۔ دوسری صنف جس میں ان کا کلام ملتا ہے رباعی ہے۔ اور جن کی مجموعی تعداد 72 ہے۔ رباعی میں ان کی فکر زیادہ واضح اور مربوط انداز میں ابھری ہے۔ وہ غزل کی طرح رباعی کے بھی ایک اہم شاعر ہیں۔ اتنے کم کلام کے باوجود ان کا نام میر و سودا کے ساتھ اس لیے لیا جاتا ہے کہ انہوں نے اردو شاعری کی روایت کو آگے بڑھانے میں وہی کام کیا ہے۔ جو میر و سودا نے کیا۔ درد جہاں ''طریق محمدیؐ'' کے ''اول الحمدین'' ہیں وہاں میر و سودا کی طرح اردو زبان کے بھی، کلام سے، ہیں۔ اپنے کلام کی ضخامت کے باوجود قائم، سوز وغیرہ اس درجے پر نہیں آتے۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد یاسین کمبے
Research Scholar, Department of Urdu, University of Kashmir

'اخلاق جلالی' کا ایک تحقیقی جائزہ

ملخص

دنیا میں کسی بھی زبان کا اپنا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی کسی زبان نے اب تک مذہب کو اور مذہب نے کسی زبان کو جنم دیا ہے۔ بلکہ یہ زبانیں اپنے فطری تقاضوں، پیداواری وسائل، تہذیبی ولسانی امتزاج اور جغرافیائی محل وقوع کے نتیجے میں وجود میں آتی ہیں۔اور وقتی تقاضوں کے ساتھ اس کے موضوعات بھی وجود میں آتے رہتے ہیں۔ جہاں تک فارسی زبان و ادبیات کے موضوعات کا سوال ہے تو ہم فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے چمنستان ادب کا ایک خوبصورت غنچہ 'علم اخلاق' ہے۔غرض علامہ محقق دوانی کی نادر تالیف ''اخلاق جلالی'' بھی اسی اخلاقی ادب کا ایک بین ثبوت ہے جس میں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی دلائل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

کلیدی الفاظ: علم وادب، سیاحت، تمدن، اخلاق، اہمیت، ادبی وفرہنگی، تحقیقی معلومات، معرفت الٰہی، وجز آن

دنیا کے مختلف مہذب قوموں کی طرح ایرانی ادباء، علماء اور شعرا قدیم زمانے سے ہی علم اخلاق کے اشراف سے متصف رہے ہیں۔اور یہ اوصاف ایرانی تہذیب وتمدن، معاشرت اور علوم و فنون میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ جس کا اعتراف دنیا کے مختلف دانشوروں نے کیا ہے مثلاً سقراط کا شاگرد گزنفون نے کہا ہے کہ ''اگر دوسری قوموں کے طبیعی اخلاق کا ایرانیوں سے موازنہ کیا جائے تو اگر ان کے اخلاق سب سے بلند نہیں ہیں تو سب سے پست بھی نہیں ہیں''۔[1] فارسی زبان وادبیات کے ادیبوں نے اپنی ذہنی، فطری اور علمی صلاحیتوں سے قدیم زمانے سے ہی علم اخلاق کو تقویت بخشی ہے۔ خواہ وہ کلیلہ ودمنہ، کیمیائی سعادت، کشف المحجوب، تذکرۃ الاولیاء، اخلاق ناصری، گلستان سعدی ہوں

یا پھر اخلاق محسنی، انوار سہیلی اور اخلاق جلالی ہوں۔

فارسی نثر میں اگر چہ مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی گئی جیسے فلسفہ، تاریخ، نجوم، ریاضی، طب، تصوف اور اخلاق وغیرہ لیکن تاریخ گواہ ہے جس قدر اس زبان شیرینی میں 'علم اخلاق' پر کتابیں لکھی گئی شاید ہی کسی اور موضوع پر اتنی تالیفات ہوئی ہے۔ مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف ادوار میں زبان فارسی میں علم اخلاق پر بے شمار کتابیں معرض وجود میں آتی رہی۔ اور اسی طرح عہد تیموریہ میں بھی موضوع مذکورہ پر چند اہم کتابیں لکھی گئی جیسے مولانا جامی کی 'بہارستان' کمال الدین حسین واعظ کاشفی کی 'اخلاق محسنی' اور محقق دوانی کی 'اخلاق جلالی' وغیرہ۔ غرض متذکرہ اخلاقی کتب میں سے میرے اس تحقیقی مقالہ کا موضوع ''اخلاق جلالی کا ایک تحقیقی جائزہ'' ہے۔ اس کتاب کا مصنف جلال الدین محمد بن سعد الدین اسعد، معروف بہ محقق دوانی ہے۔ جو عہد تیموریہ کے مشہور علماء، حکماء، ادباء، قاضی اور محققین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ آپ کے یاداشت ایام حیات مختصراً یوں ہے۔

علامہ محقق دوانی کی ولادت ۸۲۸ھ میں دوان کے قصبہ کازرون میں ہوئی۔[۲] بعض مورخین نے آپ کی تاریخ ولادت ۸۳۰ھ لکھا ہے۔[۳] کم عمری میں ہی علم و ادب کے فضل و کمال اور خداداد صلاحت سے سرفراز ہوئے۔ یہاں تک کہ تھوڑے ہی عرصے میں آپ کو ایک جید عالم، حکیم، قاضی اور محقق کی حیثیت سے شہرت نصیب ہوئی۔ بقول ڈاکٹر منظر امام ''عراق، روم، آذر بائیجان، کرمان، طبرستان، جرجان اور خراسان وغیرہ مقامات سے طلباء تحصیل علم و دانش کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔''[۴] انہیں فارسی زبان کے ساتھ ساتھ عربی زبان پر بھی دسترس حاصل تھی۔ مطالعہ کافی وسیع تھا اور تصنیف و تالیفات میں نہایت دلچسپی رکھتے تھے۔ اس طرح وہ اپنی تحقیقی معلومات کو تحریری شکل دیتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ کی تالیفات کی تعداد ۹۶ بتائی جاتی ہے۔ جن میں چھوٹے بڑے رسالے بھی شامل ہیں۔ فارسی زبان میں بارہ کتابیں اور باقی زبان عربی میں اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ فارسی زبان میں تالیفات یوں ہیں:

رسالہ لہلیلیہ، رسالہ در عرض لشکر، رسالہ عدالت، رسالہ در شرح غزل حافظ، رسالہ شرح بیتی از شیخ شبستری اور اخلاق جلالی وغیرہ۔ بالآخر اس ادیب محسن نے ۹۰۸ھ میں وفات پائی۔

اگر چہ علامہ محقق دوانی فارسی و عربی زبان میں بہت ساری کتابوں کے مؤلف ہے مگر

جس تصنیف نے انہیں ادبی جہاں میں شہرت دوام بخشا وہ ''اخلاق جلالی'' ہے۔اس کتاب کا اصلی نام ''لوامع الاشراق فی المکارم لاخلاق'' ہے۔اور مؤلف کے نام کی نسبت کی وجہ سے ''اخلاق جلالی'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

علامہ محقق دوانی نے اس کتاب کی وجہ تالیف کے بارے میں لکھا ہے کہ سلطان حسن بیگ بہادر کے پاس ایک ضخیم کتاب تھی جو داناؤں، نیک اماموں، مشہور بادشاہوں کی باتوں سے عمدہ کلمات اور بہترین دانائی کی باتوں پر مشتمل تھی۔اور بادشاہ کے بزرگ اجداد نے اس کتاب کو قیمتی جواہر کے ساتھ اپنے خزانے میں محفوظ رکھا تھا۔مگر وہ متقدمین کی تالیف تھی اس لیے غیر معروف عبارات اور ضعیف اشعار پر مشتمل تھی جس کا رواج سلطان حسن بیگ کے زمانے میں نہیں تھا۔جیسا کہ مؤلف خود رقمطراز ہے:

> ''بادشاہ کا بلند حکم اس جملہ پر نافظ ہوا کہ یہ کم مایہ حقیر اس میں ترمیم کریں اور انجام تک پہنچائے۔لیکن جب اندیشہ کی نظر سے اس پر غور کیا گیا۔تو ایسا معلوم ہوا کہ ترتیب و تطبیق کے لحاظ سے کتاب کے اجزاء بہت پریشان اور منتشر ہیں۔اور مطلب کے لحاظ سے علم اخلاق و ملک داری کے ارکان کا پورے طور پر احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔پس میری طبعیت کے معمار نے نقش میرے خیال کی تختی پر بنایا کہ اس کی تالیف اس طرح کی جائے کہ باوجود یکہ حکمت عملی کے اصول پر شامل ہو۔لیکن دلائل و اسناد میں بڑے بڑے حکمائے الٰہین کے فرامین، آئمہ دین، صوفیاء تابعین اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے کلمات کے چراغ حضرت خاتم المرسلین ﷺ کی احادیث کے چراغدان اور آیات قرآنی کے آفتابوں کے نوروں سے بھی نور چنا جائے۔۔۔۔شاہی سلطنت کے رعب کے طفیل ایسی کتاب بن جائیگی کہ علمی حقیقتوں کے طلبگاروں کو بھی اور حکمت عملی کی سڑکوں کے چلنے والوں کو بھی اس سے پورا پورا فائدہ اور کافی حصّہ ملے گا۔''[۶]

یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب کو مؤلف نے لامع کا نام دیا ہے۔اور ہر لامع میں چند فصلیں زیر بحث لائے ہیں جن کو مؤلف نے لمعات کا نام دیا ہے۔اگر چہ اخلاق جلالی میں سماجی و ادبی زندگی کے بہت سارے انواع پر تذکرہ ملتا ہے لیکن زیر بحث مقالہ میں ہم اس نادر

تصنیف کی اخلاقی اہمیت کے بارے میں اپنی تحقیقی معلومات بہم پہنچانے کی کوشش کریں گے۔اور بعض دوسرے امورات کی طرف مختصراً اشارہ کرنے پر اکتفا کریں گے۔

لامع اوّل میں ''تہذیب وتزئین اخلاق'' پر روشنی ڈالی گئی ہے اوراس میں دس (۱۰) لمعے مختلف عنوانات کے تحت بحث میں آئے ہیں۔اس طرح سے پہلا لمعہ 'اخلاق کی فضیلتوں کے بیان میں' پیش کیا گیا ہے۔فضائل اخلاق پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے علامہ دوانی یوں رقمطراز ہے:

''درحصر مکارم اخلاق نمودہ میشود کہ درعلم نفس از مباحث حکمت طبیعی مفرر شدہ کہ نفس ناطقۂ انسانی رادوقوتست۔ یکی قوت ادراک ودیگر قوت تحریک وہریک ازاین دوقوت رادوشعبہ است۔

اما قوت ادراک را یک شعبہ عقل نظری است۔وآن مبداء تأثر است از مُبادی عالیہ بقبول صورعلمی ودیگر شعبۂ عملی کہ مبدٔ بعید تحریک بدن است دوافعال جزویہ بفکر و رویت و این شعبہ از حیثیت تعلق بقوت غضب وشہوت مبدء حدوث کیفیتی چندشود کہ سبب فعلی یا انفعالی باشد۔۔۔اما قوت تحریک رادوشعبہ است یکی قوت غضبی وآن مُبدء دفع امر غیر ملائم است بروجہ غلبہ۔ودیگری قوت شہوی وآن مبدء جلب ملائم است۔۔۔''[۷]

غرض اس لمعہ میں اخلاق کی بنیادی تعلیمات کو اسلامی طناظر میں اصول وضوابط اور مختلف طریقوں، مراقبوں کے پس منظر میں بیان فرمایا ہے۔اس کے علاوہ دیگر لمعات جیسے تعریف فضائل، اقسام فضائل،فضائل سے مشابہت رکھنے والے اوصاف،اجناس رذائل، شراقت عدالت، اقسام عدالت،حصول فضائل،محافظتِ صحتِ انسانی اورامراضِ نفسانی کے بیان میں قرآن وحدیث اوراولیاء کرام،علماء دین وصوفیائے کرام کی اقوال زرین سے حسب ضرورت اپنی بحث بہم پہنچائی ہے۔مثال کے طور پر لمعہ نہم 'محافظت صحت انسانی' پر وضاحت کرتے ہوئے چند احادیث پیغمبر آخرزمان ﷺ کو دنیا پرستی سے اجتناب اور خداوند کریم کا تقرب حاصل کرنے کے بیان میں اس طرح پیش کیے ہیں:

ترجمہ:''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآل وسلم کے ہدایت کے انجام والے کلام میں بار بار دنیا کے زوائد سے پرہیز اوراس کے اسباب میں جوفریب کا سامان ہے بے رغبتی کا حکم ہیں۔ان میں سے

ایک حدیث شریف یہ ہے کہ آپ نے فرمایا'' دنیا میں بے رغبتی سے تجھے اللہ دوست رکھے گا اور اس چیز میں جو لوگوں کے پاس ہے بے رغبتی کر لوگ تجھے دوست رکھیں گے اور دوسری حدیث میں ہے ''دنیا میں ایسے رہو جیسے کوئی مسافر یا راہرو۔ اپنے آپ کو اصحاب قبور میں سے شمار کر اور ارسطا طالیس نے کہا ہے جو شخص اتنی روزی پر جو زندگی بسر کرنے کے لیے کافی ہو، قادر ہو، اس سے نہیں چاہیے کہ اس سے زیادہ طلب کرے کیونکہ اس کی کوئی انتہا نہیں۔ اور اس کے طلب کو بہت مکرہات کا سامنا ہوتا ہے اور کہا ہے کہ دنیا کے اسباب کی غرض، بیماریوں کا دفع کرنا ہے جیسے بھوک، پیاس اور بدن کی آفتوں میں مبتلا ہونے سے بچنا ہے، نہ کہ لذت حاصل کرنا، بلکہ اصل لذت صحت ہے''۔

متذکرہ عبارت سے اس بات کی تائید مؤلف نے احادیث شریف کی روشنی میں کی ہے کہ انسان کو قناعت پسند ہونا چاہیے، دنیاوی مال واسباب سے محبت نہیں اور دوسری اہم بات جو علامہ دوانی نے اس میں فرمائی وہ یہ کہ دیناوی چیزوں کی لالچ اور جاہ ومرتبے کی خواہش سے پاک رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ تجھے ایک تو خداوند کریم راضی ہوگا اور دوسرا یہ کہ دنیاوی لوگ بھی تجھے عزت کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ جسمانی صحت کی طرف یہ نکتہ حکیم زمان ارسطا طالیس کی وضاحت پیش کی ہے کہ انسان امراض کی بہترین دوا قناعت پسندی ہے۔

اسی طرح لمعہ دہم ''امراض نفسانی کے بیان میں'' مختلف زاویے سے نفس کی پاکیزگی اور باطن کو اچھائیوں اور اعلیٰ اقدار سے سنوارنے پر بحث ملتی ہے، جیسے صحت کی حفاظت ہمیشہ مزاج کے موافق غذا واشیاء کے استعمال پر زور دیا ہے۔ اس لمعہ میں آگے علم وعمل پر یوں روشنی ڈالی ہے کہ پروردگار عالم نے قرآن مجید میں حضرت رسول رحمت ﷺ کو علم کی افزائی کی دُعا کا حکم فرمایا ہے:

> ''اے محمد ﷺ کہو کہ اے میرے رب میرا علم زیادہ کر، اور جب حضرت عاشیہ صدیقہ رضاللہ عنہا نے رسول اکرم ﷺ سے سوال کیا کہ'' انسان کس چیز سے بزرگ ہوجاتا ہے'' آپ ﷺ نے فرمایا''عقل سے'' اور حضرت رسول اکرم ﷺ نے حضرت علی مرتضیٰ علیہ اسلام کو فرمایا کہ'' اے علیؑ جب قریب ہوں لوگ اپنے خالق کے طرح طرح کی نیکیوں سے پس تو اپنی عقل سے قریب ہو۔ تو قربت اور درجوں میں ان سے بڑھ جائیگا'' اور حدیث شریف میں ہے کہ'' آدمی عالم ہیں یا علم

سیکھنے والے ہیں اور باقی مکھیاں ہیں'' اصحابہ کرام میں سے ایک شخص نے حضرت رسول اکرم ﷺ سے سوال کیا کہ کون سا عمل زیادہ بزرگ ہے آپ ﷺ نے فرمایا ''علم کا'' دوسری دفعہ بھی اس نے یہی سوال کیا اور تین دفعہ دہرایا۔ آپ ﷺ نے یہی جواب دیا۔ پھر اس شخص نے کہا میں عمل کے متعلق سوال کرتا ہو نہ علم کے متعلق۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ علم کے ساتھ تھوڑا عمل کرنا جہالت کے ساتھ زیادہ عمل کرنے سے بہتر ہے''[۹]

دوسرے لامع میں ''تدبیر منزل یعنی علم خانہ داری'' کے تحت چھے (۶) لمعے بیان کیے گئے ہیں جیسے احتیاط منزل، نگہداشت خوراک اور مال، سیاست۔ اہل خانہ، نگہدارشت اولاد، حقوق والدین اور سیاست خدام کے بیان میں۔ اس کتاب کے دوسرے لامع کا آغاز خانہ داری کے اسباب کی ضرورت سے کی ہے جس سے ہمیں غذا خوری اور اسکے وسائل کے باری میں معلومات حاصل ہوتی ہے۔ اور اس میں مولف نے اس بات پر زور دیا ہے کہ انسانی غذا دوسرے حیوانات کی غذا سے مختلف ہے اور کہا ہے کہ خانہ داری کی اسباب کے لیے مکان کا ہونا انسان کے لیے لازمی ہے۔ تا کہ وہ ہر وقت اپنی زندگی کے ضرورات جیسے خوراک و دیگر اشیاء کو محفوظ رکھ سکے جس کی ضرورت ہر روز جینے کے لیے پڑھتی ہے۔

اسی طرح لمعہ دوّم ''نگہداشت خوراک اور مال کے بیان میں'' ایک جگہ پے یہ حدیث نقل کی ہے کہ '' رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا۔ اضطراب میں آ گئی اور قرار نہیں پکڑتی تھی۔ پس پہاڑوں کو پیدا کیا۔ اور زمین کو اس سے قرار دیا۔ اور فرشتوں نے اس بات پر تعجب کیا۔ اور سوال کیا کہ اے خدا تعالیٰ کوئی مخلوق پہاڑ سے بھی سخت ہوگی؟ فرمایا ہاں آگ۔ پھر فرشتوں نے پوچھا، کہ آگ سے بھی کوئی سخت ہے؟ فرمایا کہ ہاں پانی۔ پھر پوچھا کہ پانی سے بھی زیادہ سخت کوئی ہے؟ فرمایا ہاں ہوا۔ فرشتوں نے کہا ہوا سے بھی زیادہ کوئی سخت چیز ہے؟ فرمایا ہاں پوشیدہ صدقہ جو آدمی اس طرح کرے کہ دائیں ہاتھ سے دے اور بائیں کو خبر نہ ہو۔ کیونکہ اس کی تاثیر تمام اشیاء سے زیادہ ہے۔''[۱۰]

غرض اس لمعہ میں بھی انسانی اخلاق کی تطہیر قرآن اور احدیث کی روشنی میں ملتی ہے۔ اس کے علاوہ اگے اس میں میاں بیوی کے آداب، دوسرے اقرباء کے ساتھ حسن سلوک وغیرہ جیسے

عنوانات پر حکمت کے بہترین آئینے میں علمیت حاصل ہو جاتی ہے۔[9]

لمعہ پنجم میں 'حقوق والدین' پر روشنی ڈالی ہے۔ چونکہ آج کل کے اس بیانک دور میں جس میں مغربیت کا غلبہ سماج کے اکثریت پر غالب نظر آ رہا ہے اور حقوق والدین کو نظر انداز کیا جاتا ہے اس لیے اس لمعہ سے چند نکات کا ذکر کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے اس ضمن میں مصنّف نے لکھا ہے کہ اللہ کی طرف سے جو بزرگ ترین نعمات انسان کو عطا کی گئی ہے ان میں سے والدین جیسی کوئی نعمت نہیں ہے۔ چونکہ ماں باپ ہی ہمارے ظاہری وجود کا سبب ہے۔ انتہائی مشکلات کے باوجود اپنے بچوں کی بھلائی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ ماں باپ کی عظمت واحترام کے حوالے سے صاحب کتاب نے قرآنی آیات نقل فرمائی ہے جس میں خداوند کریم کی عبادت کے بعد والدین کی خدمت کا ذکر آیا ہے کہ '' وَقَضَیٰ رَبُّکَ اِلَّا تَعبُدُ و اِلّا ایّاہُ و بِالوالِدَینِ اِحسَانا ''[11]

لمعہ ششم 'نوکروں کی سیاست کے بیان میں' ہے۔ اس میں نوکروں کے ساتھ حُسن اخلاق سے پیش آنے کی تاکید کی ہے۔

تیسرا لامع ''تدبیر مدن اور رسوم بادشاہی''، یعنی علم ملک داری کے بیان میں ہے۔ اس میں سات لمعے مختلف عنوانات کے تحت بیان فرمائے ہیں۔ جیسے احتیاج وفضائل تمدن، فضائل محبت، اقسام مدنیت، سیاست ملک و آداب شاہی، آداب و رسوم مقربین، فضائل تمدن، فضائل دوستی اور لطائف مدنیت اور عوامی تعلقات کے بیان میں ہے۔

اس باب کا آغاز تمدن کی ضرورت وحکمت کے فضائل سے کی ہے اور اس میں بھی علامہ دوانی نے علم ودانش کو تمدن کے دائرے میں قرآن وآحدیث اور اہل علم وعلماء کرام کے زرین اقوال سے اپنی بحث آگے بڑھائی ہے۔ اور مؤلف کی نظر میں وہی لوگ سب سے زیادہ خوش قسمت ہیں جو دنیاوی امور کو حکمت کے ساتھ انجام دیں۔ اور اپنی زندگی کو اجتماعی طور پر ایسے انجام دیں کہ جسے اللہ تعالیٰ اسے راضی رہیں۔ مثلاً حکماء نے انسان کو اجتماع کا محتاج قرار دیا ہے۔ پس انسان کو چاہے کہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے دوسروں کے حقوق پامال نہ کریں۔ یعنی ایک انسان کو دوسرے انسان کے اس چیز پر جو اس کا حق ہے اپنا ہاتھ زبردستی نہ بڑھانا چاہیے۔ بلکہ ہر ایک کو اپنے حقوق پر راضی کر دیں اسی سوچ کو تمدن میں 'سیاست عظمیٰ' کہتے ہیں۔

لمعہ دوم میں محبت کی فضیلت یعنی باہمی بھائی چارہ مثلاً انفرادی مزاج کے بجائے عام لوگوں کی مصلحت کے ساتھ حقیقت پسند ہوں۔اس کے ضمن میں مصنف نے کہا ہے کہ پرانی حکماء کا قول ہے کہ'' دنیا کا انتظام محبت سے ہے۔کوئی چیز محبت سے خالی نہیں ہوسکتی''۔محبت کے حوالے سے دوران بحث استاد کی عظمت کا اعتراف حدیث کی روشنی میں یوں بیان فرمایا ہے:

ترجمہ''رسول اکرم ﷺ کی حدیث جہاں آپ ﷺ نے فرمایا ہے۔''خداتعالیٰ نے ہرگز کسی جاہل کو ولی نہیں بنایا'' اس کی تکذیب کرنی ہے اور یہ محبت کا مرتبہ چاہے کہ تمام مراتب سے بلندتر ہو۔ کیونکہ اس مرتبہ میں کسی اور کو شریک کرنا محض شرک ہے اور محبت کا دوسرا مرتبہ والدین کی محبت ہے۔جو اس کے وجود کے لیے ظاہری سبب ہیں اور یہ محبت اس محبت کے دوسرے درجہ پر ہے اور کسی محبت کا یہ رتبہ نہیں مگر شاگرد کی محبت استاد سے چاہیے کہ اس محبت سے زیادہ مضبوط ہو، کیونکہ اگر باپ اس کے وجود جسمانی تربیت کا باعث ہے تو استاد اس کے کمال اور روحانی تربیت کا سبب ہے اور انسانیت کی صورت کو فیض پہنچانے والا وہی ہے۔درحقیقت استاد روحانی باپ ہیں۔پس جتنی کہ روح کو جسم پر بزرگی ہے اتنی استاد کو باپ پر بزرگی ہے پس اس کی محبت مرتبہ میں خداوند تعالیٰ کی محبت کے بعد ہے اور والدین کی محبت کے اوپر ہے۔۔۔حدیث شریف میں ہے کہ''تیرے تین باپ ہیں جس نے تجھے کچھ سکھایا اور جس نے تجھے بیوی دی (یعنی نکاح میں بیٹی) اور بہترین باپ وہ ہے جس نے تجھے علم سکھایا اور حضرت علی مرتضٰی علیہ السلام سے منقول ہے کہ''جس نے مجھے ایک حرف سکھایا تحقیق اس نے مجھے اپنا غلام بنالیا''[۱۲]

مذکورہ عبارات سے واضح ہوجاتا ہے کہ حسنِ اخلاق ومحبت انسان زندگی کا خلاصہ ہے، پس ہمیں چاہیے کہ اپنے خدا اور رسول ﷺ وآل رسول ﷺ، صحابہ کرام، علماء دین اساتذہ کرام کے ساتھ ساتھ اللہ کے فرمودات کو جو قرآن مجید واحدیث کی روشنی میں اور آل رسول ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں ہمارے پاس پہنچے ہیں دوست رکھیں۔اس طرح سے ہمیں معرفت الٰہی حاصل ہوگی اور اخلاقی تزئین بھی ہوگا۔صاحب کتاب نے اس لمعہ میں ایک اہم علمی وادبی معلومات بیان فرمائی ہے۔

سید علی ہجویری نے یہ روایت نقل فرمائی ہیں کہ امام جعفر بن محمد صدق علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ''من عرف اللہ اعرض عما سواہ'' جسے اللہ کی معرفت حاصل ہوگی وہ ماسوا اللہ سے کنارہ کش ہوگیا۔اس لیے کہ جو شخص خدا سے واصل ہوجاتا ہے اس کے دل میں کسی غیر کی کوئی قدر ومنزلت نہیں رہتی۔[۱۳]

امام غزالیؒ فرماتے ہیں ''محبت تمام مقامات کی انتہائی غایت ہے'' ۱۴؎

اسی طرح شاہ عبدالحق محدّث دہلوی فرماتے ہیں ''محبت حیات قلوب وغذائے ارواحِ اہل ایمان است''یعنی محبت ایمان والوں کی روحوں کی غذا اور دلوں کی زندگی ہے'' قرآن میں ہے ''یحِبُھُمْ و یُحِبّوُ نَہ''اللہ مومن بندوں سے محبت رکھتا ہے اور وہ اس سے محبت رکھتے ہیں'' ۱۵؎

مختصر طور پر دیگر لمعات میں علامہ محقق دوانی نے تمدن کے اقسام، سیاست ملک وآداب شاہی، آداب ورسوم مقربین، دوستی کی فضیلت اور تمدن کے لطائف کے ساتھ ساتھ عوامی تعلقات پر اپنی تحقیقی بحث کی ہے۔ جو انسانی زندگی کے لیے نہایت اہم علمی معلومات مثلاً لمعہ ہفتم میں عام لوگوں سے رہنے سہنے کے آداب کو اسلامی طور طریقے سے حکمت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ حدیث کی روشنی میں لکھتے ہیں کہ'' متکبروں کے ساتھ تکبر کرنا صدقہ ہے'' اور اس کی وضاحت میں یہ دلیل پیش کی ہے کہ اگر متکبر لوگوں کے ساتھ تکبر کریں تو ممکن ہے کہ وہ تکبر سے باز آئیں۔ آگے لکھتے ہیں کہ غریب لوگ اگر طالب علم ہوں تو ان کے ساتھ فرزندوں کی طرح پیش آجائیں اور انکی اپنی طاقت کے مطابق مدد کریں وغیرہ۔

ادبی وفرہنگی اہمیت:

مذکورہ بالا تینوں لامع میں ذیلی عنوانات کے تحت ۲۳ لمعے محقق دوانی نے مذکورہ کتاب میں قرآن واحدیث اور ارشاداتِ آل رسول ﷺ واصحابہ کرام، علماء دین، صوفیاء کرام اور یونانی حکماء کے زرین اقوال کے ساتھ حسب ضرورت بیان کیے ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب کے آغاز میں ابواب سے پہلے ایک مقدمہ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد جیسا کہ قبلاً اشارہ دیا جاچکا ہے تین لامع کا تزکرہ آیا ہے۔ جن میں سے چند عنوانات کا راقم نے ضمناً ثبوت کے طور پر تذکرہ کیا ہے اس طرح سے یہ کتاب ادبی وفرہنگی اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ چونکہ کتاب کے مطالعے سے انسان میں فکر واظہار اور انسانی زندگی کے مختلف شعبوں اور متعدد پہلوؤں پر پُر اثر جانکاری ملتی ہے اس کے علاوہ معاشی، ادبی، علمی اور روحانی زندگی گزارنے میں بھی رہنمائی ملتی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بات بھی آئینہ ہو جاتی ہے کہ انفرادی اور اجتماعی طور پر انسانی زندگی میں عام طور سے جن علوم وآداب کی آگاہی انسان کو لازمی ہے کی جانکاری حاصل ہو جاتی ہے۔ اگر ان مسائل پر جو اس کتاب کی وضاحت میں آئے ہیں گہرائی سے پڑا جائے تو

اپنے اندر خوبیوں اور خامیوں کا بھی اصلاح ہوسکتی ہے۔

دنیا اتنی کثیر الابعاد اور انسانی زندگی کے اتنے قیامت خیز جلوؤں سے معمور ہے کہ بہ یک نظر اس کا مطالعہ کرنا نہ صرف مشکل ہے بلکہ قدرے دشوار بھی۔ مگر مطالعہ کتب ھٰذا سے پتہ چلتا ہے کہ محقق دوانی نے جو تحقیقی معلومات اس میں پیش کی ہے اسے قاری کے فہم وادراک میں وسعت پیدا ہوسکتی ہے۔ کیونکہ اس ضمن میں مؤلف نے علم اخلاق کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ علم اخلاق سے متعلق شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی ارشاد فرماتے ہیں کہ ''وہ لوگ خوش نصیب ہیں جن کو علم اخلاق ملے ہیں''۔ ۱۶؎

جہاں تک علم اخلاق کے بنیادی اصولوں کے سلسلے میں علامہ محقق دوانی کے خیالات کا تعلق ہے تو آپ نے اس ضخیم کتاب میں انسانی زندگی کو مسائل پر غور وفکر، معرفت محبت الٰہی اور حُسن اخلاق پر زیادہ زور دیا ہے۔ یہ کام ان کے زبردست فہم وادراک، محنت شاقہ، محققانہ خلوص ودیانت، معروضیت، دلائل وبراہین کے استدال، بہت گہرے مطالعے اور زبان وبیان کے پورے زور وجوش، نیز استادانہ اسلوب کا مُنہ بولتا ثبوت دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف محققین ومؤرخین نے موصوف کی اس تحقیقی کام کے بارے میں توصیفی جملے کہے ہیں مثلاً ڈاکٹر ظہورالدین احمد لکھتے ہیں ''اخلاق جلالی کے بعد اب تک مشرقی انداز پر فلسفہ اخلاق کی کوئی کتاب اس جامعیت سے نہیں لکھی گئی۔ ارسطو نے فضایل ورذایل کی بنیاد نظریہ افراط وتقریظ پر رکھی تھی۔ دوانی نے قانونی نتائج کو بھی پیش کیا ہے۔'' ۱۷؎

مورخین 'فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ' رقمطراز ہیں ''اخلاق جلالی فارسی میں اپنے موضوع پر ایک اہم تصنیف ہے۔'' ۱۸؎

اس کتاب کی ایک اور ادبی وعلمی اہمیت اس بات سے ہے کہ مؤلف نے بعض انسانی زندگی کے پہلوؤں کی وضاحت میں سنائی، عطار، حافظ وغیرہ جیسے بزرگ عارف فارسی شعرا کے کلام سے بھی زینت بخشی ہے۔ قابل ذکر اہم بات یہ بھی ہے کہ انہوں نے قرآن واحدیث کے حوالے بکثرت دیئے ہیں اور اپنی صلاحیت کو بروئے کار لانے میں زیادہ تر شریعت اسلامی کے دائرے میں اخلاقی نظریات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مشہور یونانی فلسفی وحکماء کے نظریات واثرات بھی اس کتاب میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اسلوب وبیان کے لحاظ سے یہ کتاب فارسی

زبان کے ساتھ عربی زبان سے بھی متاثر نظر آتی ہے۔ جیسا کہ اس کتاب کے اصل نام سے ہی پتہ چلتا ہے۔ نیز فلسفی بحث ہونے کی سبب بعض جگہوں پر مشکل اور نامانوس الفاظ بھی آ گئے ہیں۔

نتیجہ: مجموعی طور پر ہم کہ سکتے ہیں کہ فارسی زبان وادبیات کے دوسرے بڑے شاہکاروں کی طرح جن میں مربوط سماجی واخلاقی اورادبی نظام کو پیش کیا گیا ہے ''اخلاق جلالی'' بھی ان میں سے ایک عظیم شاہکار ہے۔ اگر چہ اپنے عہد میں لکھے جانے والے بعض اخلاقی کتابوں جیسے ''گلستان سعدیؔ، اخلاق ناصری'' وغیرہ کے معیار کو نہیں پہنچ سکی۔ تاہم مذکورہ کتاب کے مطالعے سے علم وادب اور ذہن کی ایک قابل قدر تطہیر ہو سکتی ہے۔ اور یہی علمی وادبی تطہیر انسان کی عظمت کا سبب بنتا ہے۔ تزئین اخلاق ہی انسان کو حق وصداقت کا پتہ دیتا ہے نہیں تو بے شمار علم ہونے کے باوجود خدانخواستہ بداخلاقی انسان کو ہلاکت سے ملا دیتی ہے۔ یہ ضخیم کتاب اپنی جامعیت کی وجہ سے نہ صرف اپنے ملک کے دانشوروں کی زیر مطالعہ رہی، بلکہ بیرون ملک کے اکثر محققین نے بھی اس سے استفادہ حاصل کیا ہے اور مختلف زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکی ہے، خاص کر ہماری وادی کشمیر کے ایک عظیم قلم کار، محقق، ادیب، شاعر، عالم پروفیسر خواجہ محمد طیب شاہ صدیقی ضیغم نے اسے انگریزی زبان کا جامہ پہنایا ہے۔ جسے اس کی اہمیت وافادیت کا پتہ چلتا ہے۔

نتیجہ کے طور پر ہم کہ سکتے ہیں کہ علامہ محقق دوانی نے ''اخلاق جلالی'' کو تالیف کر کے فارسی زبان کے اخلاقی معیار کو بلند کیا ہے۔ اور اس کے مطالعے سے نہ صرف مادی دنیا میں کام آنے والی معلومات حاصل ہو جاتی ہے بلکہ آخرت کو سنوارنے کی نہایت مفید رہنمائی بھی ملتی ہے غرض اس کتاب کی ادبی واخلاقی اہمیت فارسی زبان ادبیات میں گلستان سعدی، بہارستان جامی اور اخلاق ناصری وغیرہ کی طرح ہمیشہ رہے گی۔

☆☆☆

حواشی:۔

۱۔''اسلام وایران کے تقابلی خدمات'' جلداوّل،تالیف آیت اللہ شہید مرتضٰی مطہری،مترجم مولانا شیخ ممتاز علی، سال اشاعت ۲۰۱۱ء،ناشر رایزنی فرہنگی سفارت جمہوراسلامی ایران،نئی دلی،ص۔۲۷۲

۲۔''چکیدہ،تاریخ ادبیات ایران'' حصہ نثر،جلد دوم از ڈاکٹر منظرامام،باراول ۲۰۰۰ء،بھارت آفسٹ پرنٹرس،دہلی،ص۔ ۱۱۰

۳۔''فارسی ادب کے ارتقا کی مختصر تاریخ'' پروفیسر ذبیح اللہ صفا،مترجم عندلیب زہرا کا مپوری،سال ۱۹۷۵ء، مطبوعہ نظامی پریس،لکھنؤ،ص۔۷۵

۴۔''چکیدہ،تاریخ ادبیات ایران'' حصہ نثر،جلد دوم از ڈاکٹر منظرامام،باراول ۲۰۰۰ء،طباعت بھارت آفسٹ پرنٹرس، دہلی،ص۔ ۱۱۱

۵۔تاریخ ادبیات ایران از ڈاکٹر رضا زادہ شفق مترجمہ سید مُبارزالدین رفت مطبع لاڈس پبلیشنگ ہاوس آف لاڈس بک سنٹر سرینگر کشمیر۔سال ۱۴۲۴ھ،ص۔۴۴۵

۶۔''اخلاق جلالی'' اردو ترجمہ از اقبال احمد سال ۱۹۴۷ء،ناشر دین محمدی پریس لاہور،ص۔۴۱

7. online web site https://archive>details>in.ernet.dli.Pg no 23

۸۔''اخلاق جلالی'' اردو ترجمہ از اقبال احمد سال ۱۹۴۷ء،ناشر دین محمدی پریس لاہور،ص۔۹۱

۹۔''اخلاق جلالی'' اردو ترجمہ از اقبال احمد سال ۱۹۴۷ء،ناشر دین محمدی پریس لاہور،ص۔۹۹۔۱۰۰

۱۰۔''اخلاق جلالی'' اردو ترجمہ از اقبال احمد سال ۱۹۴۷ء،ناشر دین محمدی پریس لاہور،ص۔۱۳۶

۱۱۔''اخلاق جلالی'' اردو ترجمہ از اقبال احمد سال ۱۹۴۷ء،ناشر دین محمدی پریس لاہور،ص۔۱۵۳

۱۲۔''اخلاق جلالی'' اردو ترجمہ از اقبال احمد سال ۱۹۴۷ء،ناشر دین محمدی پریس لاہور،ص۔۱۷۶

۱۳۔''کشف المحجوب'' از حضرت داتا گنج بخش شیخ علی ہجویری،مترجم مفتی غلام معین الدین یغمیؒ،سال ۱۹۷۰ء،مطبع نسیم بکڈ پیواردو بازار،دلی،ص۔۱۲۷

۱۴۔''غالب اور تصّوف'' سیّد محمد مصطفٰی صابری،سال اشاعت ۱۹۷۷ء،طباعت نیشنل آرٹ پریس۔الہ آباد،ص۔۹۵

۱۵۔''غالب اور تصّوف'' سیّد محمد مصطفٰی صابری،سال اشاعت ۱۹۷۷ء،طباعت نیشنل آرٹ پریس۔الہ آباد،ص۔۹۵

۱۶۔''غالب اور تصّوف'' سیّد محمد مصطفٰی صابری،سال اشاعت ۱۹۷۷ء،طباعت نیشنل آرٹ پریس۔الہ آباد،ص۔۹۵

۱۷۔''ایرانی ادب'' از ڈاکٹر ظہورالدین احمد،سال اشاعت ۱۳۷۵ھ،ناشر مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان،اسلام آباد،ص۔۲۰۱

۱۸۔''فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ'' از ڈاکٹر محمد ریاض۔ڈاکٹر صدیق شبلی،اشاعت ۲۰۰۲ء،مطبع کاک آفسٹ پرنٹرس،دہلی،ص ۱۰۱

☆☆☆

ڈاکٹر محمد افروز عالم

Assistant Professor, Department of Persian, University of Kashmir,

ایران میں بچوں اور نو جوانوں کے ادب کی ایک مختصر تاریخ

(ادبیات کودکان ونو جوانان در ایران)

تلخیص:

بچے ہمارے کلاسیکی ادبی سرمائے میں کبھی بھی اپنے لیے مستقل ادب کی مطبوعات نہیں رکھتے ہیں۔ وہ لوگ اپنے اسی بچپن کے ابتدائی ایام سے ہی بڑے لوگوں کے ساتھ ہم قدم اور ہمنوا رہے ہیں۔ پہاڑوں اور کھیتوں میں ان کے ساتھ مل کر کام کرتے رہے ہیں۔ اور مکتب و مدرسے میں ان لوگوں سے کندھے سے کندھا ملا کر قرآن واحادیث، منطق وفلسفہ، مناجات وکلمہ اور معروف شعراء جیسے حافظ، سعدی اور مولانا کے اشعار رٹ رہے تھے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر نصاب الصبیان الفبا سیکھنے کی طرف رخ کر رہے تھے۔ جب کہ ایسا بالکل نہیں ہے کہ ادب کا دروازہ چھوٹے بچوں کے لیے کبھی بھی بند رہا ہو۔ وہ قوم جو تمدن اور شہریت میں قابل توجہ مراحل طے کیے ہیں اور اپنی تاریخ کے کچھ حصوں کو نسل در نسل ترقی کی راہ پر گامزن کرتے رہے ہیں۔ اپنے بچوں کی توانائی، استعداد، پرورش اور تعلیم وتربیت سے بے توجہ نہیں رہ سکتے تھے۔ نسل گزشتہ بھی کوشش کر رہی تھی کہ اپنی اجتماعی اور تمدنی ماحصل اور علمی تجربات کو نسل بعد کی طرف منتقل کرے اور ان تجربات کو سکھانے کے راہ میں ایک ادبی اور لسانی میدان بھی رہا ہے۔ اور آج بھی بچوں کے ادب پر خوب توجہ دی جارہی ہے۔

کلیدی الفاظ: ادب اطفال، فلسفہ قدیم، اخلاق، منطق وفلسفہ، معما، لالایی، چیستان، بیت بازی، نغمہ بازی۔

ادبی اسباق کے سیکھانے کے معمولاً دوطریقے شفاہی اور مکتوب امکان پذیر رہے ہیں۔ ایران کے شفاہی ادبی سنت بچوں کے لیے بچپن کی زندگی کے پہلے لمحات سے بڑے مقام کے قائل رہے ہیں۔اورانہیں کو سیکھنے سیکھانے کے راستے ہمیشہ ہموار کرتے اوراس کو لازم قرار دے رہے تھے۔ زیادہ تر قصے اور گوناگوں افسانے جو تاریخ میں پہلے دور سے ایرانی تمدنی اور وہاں کے ماحول میں چلے آرہے تھے۔ان میں سے بیشتر اساطیری ماحصل کے عنوان کے ساتھ عام ادب میں کلاسیکی ادبی حکایت بن کر داخل ہورہے تھے۔ جو خاص کر بچوں کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ان سے پہلے جیسے لالایی ها، معماها، چیستانها، گویه ها، نغمه بازی اور نیم نغمگی اپنے مخاطبین ہمیشہ بچوں اور نوجوانوں کے درمیان ڈھونڈتے رہے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ایرانی رسمی ادب کا زیادہ تر حصہ بڑوں کے لیے ہے تو فارسی کا عام ادب زیادہ تر بچوں سے تعلق رکھتا ہے۔

اسلام سے پہلے کے ادب سے باقی بچے ہوئے آثار کے درمیان روایات، افسانے اور اسطورہ، معنوی ادبیات سے مربوط نیم تاریخی آثار جیسے خدائی نامه ها، یادگارزیران،داستان بهرام چوبین، رستم و اسفندیار، پیرانویسه اوراس کے علاوہ بھی کچھ دوسری تخلیقات جن کو بچوں سے مربوط سمجھ سکتے ہیں۔دینکرت،بندهشن،ارداویرافنامه کی کتابوں میں اور مخصوصاً هزار افسان کتاب جو اسلامی دور میں هزار و یك شب کے نام سے معروف ہوا ہے۔داستانیں، بچوں کی طبعیت کا مناسب اور ملائم عناصر رکھتی ہیں۔ یہاں تک کہ آج بھی اس مقصد کے لیے دوبارہ لکھی اور پڑھی جارہی ہیں۔

اسلامی دور کے ادب میں بھی حماسی مجموعے اور غنائی منظوم داستانوں کی قبیل سے جیسے نظامی اوران کی تقلید کرنے والوں کی تخلیقات، منثور داستانی آثار جیسے سمك عیار، درابنامه، طوطی نامه اور داستانی مجموعے جیسے کلیله و دمنه، جوامع الحکایات، گلستان سعدی اوران میں سے ہر ایک کے مختلف مقلدین نے جو سبق آموز داستانوں سے سرشار تخلیقات پیش کیے ہیں، خاص طور سے اخلاقی و تربیتی کتابیں جیسے قابوس نامه، بحرالفوائد، کیمای سعادت اور اخلاق ناصری جو ایک مستقل طرز اور سبق آموز تربیتی مسائل سے بھرپور لکھی گئی ہیں، کم نہیں ہیں۔(۴۸) آخر کے ادوار میں، مخصوصاً قاچاری دور میں جس نے ایران میں نئی تعلیم و تربیت کے راستے ہموار کیے، کچھ لوگ جیسے عبدالرحیم تبریزی(طالبوف سے معروف) علمی اور

سبق آموز داستان لکھے۔ان کے بعد کچھ شعرا جیسے ایـــرج میـــرزا کے نغمے سے بھرپور بچوں کے اشعار لکھنے سے بچوں کے نئے ادب کے لیے راستے ہموار کیے ہیں۔

جدید مفہوم میں بچوں کا ادب، جدید ادبی قالب سے جیسے رمان، داستان کوتاہ، ڈراما اور مقالے اسی آخری صدی اور مغربی ممالک کے زیر اثر اس کے نمونے ایران میں توجہ کا مرکز بنے ہیں۔بچوں اور نوجوانوں کا ادب اس اعتبار سے ذوقی اور فکری تمام تخلیقات پر اطلاق ہوتا ہے جو نوجوانوں اور بچوں کی روح کی رشد و نشو نما کے لیے مناسب شعر اور داستان مختلف قالب میں سادہ علمی کتابیں فیـلـم نامہ اور سبق آموز ڈرامے ان کے تمدن کی وسعت اور فکر و ذوق کی پرورش کے لیے فراہم کی جاتی ہیں۔یا نوجوان اور بچوں کی خاص ضرورت کے مدنظر جو بڑوں کی ضرورت سے بالکل الگ ہے۔

بچوں کے ادب کی خصوصیات کو اس طرح خلاصہ کر سکتے ہیں۔

(۱) بچوں اور نوجوانوں کے تیز طرار نظر کی ارزیابی اور ایسی ضرورت کو شامل کرنا جو نئی معلومات دینی، اجتماعی، ادبی اور علمی مسائل رکھتے ہوں۔

(۲) مختلف تجربوں کو نوجوان نسلوں میں منتقل کرنا۔

(۳) بچوں اور نوجوانوں کی معلومات کی افزائش مختلف میدان میں خاص طور سے ان اطلاعات سے جو درسی کتابوں میں انہیں حاصل نہ ہو رہی ہوں۔

(۴) بچوں کی جہاں بینی اور اس کے علم میں افزائش، زندگی کی ضرورتوں اور اجتماعی ماحول کی نسبت ان کی پہچان میں وسعت دینا۔

(۵) بچوں کے لطف کی ضرورت کو اطمنان دلانا جو اس کی شخصیت کو موثر اور معتدل بناتا ہے۔

(۶) بچوں کی فرصت کے اوقات کو شائستہ طریقے سے پر کرنا اور کامیاب زندگی کی مثالوں سے متعارف کرانا۔اپنی سرزمین اور غیر سرزمین کے علم و ادب اور بزرگان دین کی زندگی سے آشنا کرانا۔

ایران میں بچوں کے نئے ادب پر ایک سرسری نظر:۔

انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل میں دنیا کی صنعتی اور علمی پیش رفت سے آشنائی اور موازنے کے ساتھ ایران میں بچوں کے ادب کی طرف توجہ کی ضرورت کو محسوس کیا گیا۔خاص طور سے جب تعلیم و تربیت دھیرے دھیرے عام ہو رہی تھی اور میلان کو اس طرح کے ادبی ایجاد اور

رشد کے لیے زیادہ سے زیادہ فراہم کیا جا رہا تھا۔ باوجود اس کے اسلامی تعلیمات اور تمدن جو پیغمبر اکرمؐ اور دینی پیشواؤں کے طریقے سے پہنچی، خاص طور سے بچوں کی صحیح تربیت پر تاکید کی گئی ہے۔ مؤثر تربیت کی روش جو علمی موجودات پر زندگی کی خاص ضرورتوں کو بچپن میں ہی منظّم بنایا گیا ہے۔ اس طرح سے کام منظّم نہیں ہوا ہے۔ اس کی علت بھی شاید یہ ہوگی کہ ہمارے بڑے لوگ کبھی بھی بچپن کے دوران ایک مستقل مرحلہ خاص سیرت اور کیفیت کے ساتھ نہیں دیکھتے اور دوسرے الفاظ میں بچوں کو بڑے لوگ ہمیشہ بچہ ہی سمجھتے ہیں، اس وجہ سے زندگی کے عطف و محبت اور اس کی رشد کے مرحلے کو الگ الگ نہیں شمار کر رہے تھے۔

ہمارے عام ادب ان تمام لالائی اور شیرینی واقعی اور تمثیلی داستانوں کے باوجود بچوں کی فکر اور عاطفہ کی پرورش کے لیے ایک سرشار منبع حساب کر سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمارے زمانے میں مناسب طریقے سے بچوں کے لیے دوبارہ لکھی جائے۔ پہلا شخص جس نے ایران کے عام ادبی اہمیت میں بچوں کے لیے توجہ کی، فضل الله صبحی مهتدی تھے۔ جنہوں نے بچوں کی مناسب داستان کو ان میں سے انتخاب کر کے دوبارہ لکھا۔ ان سے پہلے صادق هدایت نے بھی عام ادب کی اہمیت کی طرف توجہ کی تھی۔ لیکن صبحی نے اُس کو بچوں کے استفادہ کے لیے تیار کیا۔ اس کے بعد بڑی تعداد میں لوگوں نے اس کام کی طرف رخ کیا اور عام داستانوں میں سے بہت سارے کو دوبارہ لکھنے کے ساتھ نئی نسل کے ارتباط کو رسوم گزشتہ کے آداب و فرہنگ کے ساتھ آشنائی برقرار کیے۔ صبحی ہر جمعہ کی صبح ریڈیو کے ذریعے بچوں کے مخصوص پروگرام "بـچـه هـاسـلام" کی عبارت کے ساتھ شروع کرتا تھا اور بچوں کی دلچسپی اور اشتیاق کے لیے قصے کہتا تھا اس طرح سے "پدر بچه ها" سے مشہور ہو گئے تھے۔

اپنی ابتدائی دور میں عباس یمینی شریف نے مختلف تخلیقات اور دلکش و شریں اشعار بچوں کے لیے لکھ کر کافی اہمیت حاصل کی۔ یمینی شریف کے اشعار برسوں تک ایران کی درسی کتابوں میں شامل ہوتے رہے تھے اور تمام لوگ ان کے نام و زبان سے آشنا تھے۔ یمینی شریف تنہا بچوں کے شاعر اور قلم کار نہیں ہیں۔ وہ پہلے لوگوں میں سے تھے جنہوں نے بچوں کے لیے مخصوص مجلّے نشر و اشاعت کیے اور مدت تک "دانش آموز" مجلّے کے مدیر رہے اور ان میں سے "کیهـان بچه ها" کو اپنے ذمے رکھا۔ وہ ان تمام کے علاوہ بہت زیادہ خارجی تخلیقات بچوں کے ادب کے میدان میں فارسی میں شائع کیے۔ کچھ مطبوعات تیسری اور چوتھی دہائی میں زیادہ

تر بچوں کے ادب کے برجستہ تخلیقات کو فارسی میں ترجمہ کر کے شائع کروائے۔ کچھ مترجم جیسے علی تقی وزیری، روحی ارباب، مهری آهی مختلف اقوام کے عام افسانے اور هانس کریستیان آندرسن (Hans Christain Andersen, Father of Children Literature) کے افسانے کو فارسی میں ترجمہ کر کے ایرانی بچوں کو دوسری دنیا کے ادب سے روشناس کرائے۔

اس زمانے میں جو سب سے اہم نکات بچوں کے ادب میں داخل ہوئے، تصویری کتابیں تھیں۔ تیسری دہائی کے آخری ایام میں دو کتابیں "کدوی قلقله زن و نرگس" اور "عروسك موطلائی" تصویری شکل میں چھپ کر سامنے آئیں۔ اور ایران میں بچوں کے ادب کے لیے تصویر سازی کی طرف توجہ مبذول کی۔ (۴۹) بعد میں اسی مسیر میں نقاش جیسے فرشید مشقالی ایرانی ہنر کے میدان میں ظاہر ہوئے۔ تہران کے اعلیٰ تعلیمی ادارہ میں معلم کی تربیت کے رشتے کی بنیاد پڑی اور معلم کے ہنر کی تاکید، خاص طور سے ان کے کاموں کے اختصاص اور برتری مخصوصاً روشنگری اور واضح دلیل میں پیش کی گئی۔ کچھ لوگ جیسے ڈاکٹر ہوشار "دانش سرای عالی" میں تعلیم و تربیت کے اصول کے استاد (Academic Staff College) بچوں اور نوجوانوں کے مسائل کی طرف توجہ کی ضرورت اور ان میں سے ان کے ادب کو زیادہ سے زیادہ توجہ دینے کے لیے زور ڈال رہے تھے۔

بچوں کے خاص ادب آموزش کی رشد کے لیے ایک بہترین عامل کے طور پر اور طالب علموں کے فارغ اوقات کو پُر کرنے کے لیے انہی برسوں سے ملک کے آموزش و پرورش کے عہدیداروں کی توجہ کا مرکز بن گیا اور مستقل درستی کے عنوان کے ساتھ دانش سرای عالی تہران کو معلموں کی تعلیم و تربیت کا مرکز قرار دیا گیا۔ انقلاب کی دہائیوں کے قریب تک ملک کی کچھ دانشگاہیں جن میں براہ راست معلموں کی تربیت نہ تھی۔ درسی مضامین کے کچھ حصوں کو "ادبیات کودك" کے نام سے سمویا، اس طرح سے بچوں کی استعداد کی پرورش اور ذوقی مسائل کو بہتر بنانے کی ضرورت کو جلد سے جلد بروے کار لایا۔

بچوں اور نوجوان کے ادب کے خاص اقدامات اور انجمنیں:

جدید تعلیم و تربیت کی طرز کے پانے کی اہمیت جدید کتابوں کے مضامین اور ان کی تدریس کی روش کی بنیاد پر ممکن ہوسکا کہ تعلیم و تعلم کی عمر کو کچھ حد تک نیچے لاسکیں۔ اس معنی میں کہ اگر پہلے لازم

تھا۔ بچے ابتداً تعلیمی اداروں میں پڑھنے اور لکھنے کو کچھ حد تک اعلیٰ معیار اختیار کرے۔ بعد میں کتابیں پڑھے یہ نئے طریقے یہاں تک نو آموز طالب علم کو بھی مناسب زبان فراہم کر رہا تھا اور مطالعہ کی عمر کو لکھنے کی عمر سے ہم آہنگ کر رہا تھا۔ یہ امر مرکزوں کو راستے پہ لانا اور ضرورت کے حساب سے ادارے کی تاسیس خاص طور سے بچوں اور نوجوان کے ادب کے لیے راہ ہموار کیے۔

۱۴۳۱ش/ ۲۶۹۱ء میں "شورای کتاب کودك" ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ جماعت کے ماتحت تاسیس ہوئی جس کا اصلی ہدف کتابوں کی حالت کو بہتر بنانا اور بچوں کے لیے مخصوص نشریات اور ان کی تشویق باہدف اور اصولی مطالعے کی طرف کرنا تھا۔

تین سال بعد شوریٰ معلموں اور مربیوں کے ساتھ ارتباط کے مقصد سے بچوں کے ادب سے متعلق مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں نے ایک ماہنامہ نشریہ "ماهنامه شورای کتاب کودك" کے نام سے بنیاد رکھی جس کی نشر و اشاعت سالوں تک جاری رہی اور اس طریقے سے بہت زیادہ مقالات شوریٰ کے ممبران کی کوشش اور دوسرے دانشمندوں کی جانب سے نوجوانوں اور بچوں کے مسائل کے بارے میں تالیف اور ترجمہ ہو کر زیور طباعت سے ہمکنار ہوئے۔ ''ماهنامه شورای کتاب کودك" کے اولین شماروں میں سے جو اردیبهشت ماه ۱۴۳۱ش/ ۲۶۹۱ء میں شائع ہوئی۔ خط مشی کے بیان ماہنامہ میں اس طرح سے آیا ہے۔

"شورای کتاب کودك" کے مدیر کی جماعت اس شورای کے ہدف کی طرف توجہ کے ساتھ عزم مصمم کیا ہے کہ مسلسل ماہنامہ اس شوری کے دلچسپی کے لیے بھیجیں گے۔ اس ماہنامہ میں جو کچھ ایران اور بچوں کی دنیا ہے، بچوں اور نوجوانوں کی آموزش کی بھلائی کے لیے انجام پا رہا ہے قابل احترام قارئین کے سامنے پیش کی جائیں گی۔ اسی طرح سے امید ہے کہ مسلسل، جالب اور سبق آموز مطالب کو نشریات تیار کرنے کے میدان میں نوجوانوں اور بچوں کی کتابوں سے جو دسترس میں ہیں، اور پہلے کے لوگوں کی دلچسپی کے باعث رہی ہیں، سے استفادہ کیا جائے گا۔ ان تمام چیزوں سے آگے بڑھ کے ہر ماہ مفید کتابوں میں سے کچھ مختلف عمر کے بچوں کے لیے پیش کی جائیں گی۔

شورای کتاب کودك کی فعالیت خوش قسمتی سے انقلاب کے بعد بھی جاری رہیں، اس کے بنیادی اقدامات میں سے ایک یہ ہے کہ فرهنگ نامه کودکان و نوجوانان کی تالیف

ان ہی آخری برسوں میں نتیجے کو پہنچی اور اب تک ۱۳۷۸ش/ ۱۹۹۹ء میں اس کتاب کی تین جلدیں شائع چکی ہیں۔ اس طور سے معلوماتی مقالات اور مجلّات کے دوسرے گوشے بھی تیار اور تدوین ہوکر زیور طباعت سے مزین ہوگئے ہیں۔

ان ہی سالوں میں ایک مجموعہ "پیك" کے عنوان کے تحت وزارت آموزش و پرورش (HRD) کی طرف سے شائع ہونا شروع ہوا۔ جو طالب علموں اور بچوں کو مطالعے کی جانب راغب کرنے میں بہت اہم رول ادا کر رہا ہے۔

۱۳۳۴ش/ ۱۹۵۱ء میں "کانون پرورش فکری کودکان و نوجوانان" کی بنیاد پڑی اور وسیع میدان میں مختلف مسائل کے طور پر بچوں کے ادب سے مربوط بچوں کی فکری پرورش اور اس کی رشد کے لیے مقرر کیا گیا۔ پرانی انجمنیں عمومی کتاب خانے کی ترویج وتاسیس کے ذریعے خاص کر پورے ملک میں بچوں کے لیے ان میں سے "سیار کتابخانہ" (Library on Wheels) کی شکل میں اور چند مطبوعات کی نشر واشاعت مترجموں، مؤلفوں، نقاشوں اور جوان مصوروں کی ایک بڑی جماعت اور ذی استعداد لوگوں کو جذب کر سکا۔ ان کی مدد کے ساتھ اور مالی امکانات کی مدد سے خاص کر جو خوبصورت کتابیں، عمدہ نشریہ، مطلوب کیفیت کے ساتھ تالیف اور ترجمہ دونوں صورتوں میں وسیع مناسب پیمائش میں ہر عمر کے ساتھ ملک کے نوجوانوں اور بچوں کے اختیار میں دیا جاتا ہے۔ تہران کے علاوہ انجمن کے شعبے بڑے شروں میں خاص کر صوبے جات کے مرکزوں میں اس طرح کے کتاب خانے کی زیادہ سے زیادہ ایجاد کرنے کی طرف لوگوں کی توجہ کو مبذول کیا۔ شہر کے نوجوانوں اور بچوں کی دلچسپی کتاب اور مطالعے کی طرف کھینچنے میں اہم رول ادا کیا۔ نوجوانوں اور بچوں کے خاص قلم کاروں میں چوتھی اور پانچویں دہائی کے نوجوانوں میں سے اکثر کانون پرورش فکری کے ساتھ بھی منسلک رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کے نام جیسے نادر ابراهیمی، محمود آزاد جبار باغچه بان، مهدخت دولت آبادی، نور الدین زرین کلك، احمد شاملو ، سیروش طاهباز، قدسی قاضی نور، محمود کیانوش، علی اکبر نعمتی، عباس یمینی شریف ان میں سے سب سے زیادہ مشہور ومعروف ہیں۔

ان ہی برسوں میں مهدی آذر یزدی ایرانی کلاسیکی ادب کی بازنویسی نوجوانوں اور بچوں کے لیے تن تنہا ہمت جٹا لیے اور کلاسیکی فارسی داستانوں کے متون کی بنیاد پر بہت ہی مفید "قصه هاى خوب براى

بچه های خوب" کلی عنوان کے تحت سامنے لائے۔

چوتھی دہائی کے ابتدائی برسوں میں بچوں کے ادب کے قلمرو میں صمد بهرنگی کا نام بھی لیا جانا چاہیے جو کہ بچوں کے ساتھ کام کو آذربائیجان کے ایک گاؤں میں معلّمی سے شروع کیا۔ اور بچوں کی تربیتی اور فکری خاص مشکلات کے مشاہدے کے ساتھ بچوں کے ادب کے درد کو اپنے اندر محسوس کیا اور شروعات میں ایک طرز بچوں کی پرورش کے لیے ایجاد کی۔ جو ایک کتاب کی شکل میں "کندو کاو" کے عنوان سے مسائل تربیتی ایران میں شائع ہوا۔ بعد میں بھی اپنی عینی مشاہدات اور واقعات کی تلخی جو کے اپنے قرب وجوار میں دیکھ رہے تھے، سامنے لائے۔ صمد بهرنگی کی سب سے مشہور داستانی تخلیق "ماهی سیاه کوچولو" جو شدت کے ساتھ بچوں اور نوجوانوں کے ادب کے قلم کاروں کی تقلید اور توجہ کا مرکز بنا۔

صمد بهرنگی نے جو دوسری اہم داستان کو تاہ بچوں کے لیے لکھیں اس طرح سے تھیں

بیست و چهار ساعت در خواب و بیداری، تلخون، کورا غلو و کچل حمزه، یك هلو و هزار هلو ،ان ہی برسوں میں بچوں اور نوجوانوں کے لیے دینی آثار کے میلان میں خلا محسوس ہو رہا تھا اس وجہ سے کہ کوئی بھی مطالب جس کو میں نے شمار کیا دینی پہلو نہیں رکھتا بلکہ کبھی کبھی اس کے مقابلے کے نکتے میں بھی قرار پا رہا تھا۔ یہ امر مرتضٰی مطہری کو اس کی طرف رغبت دلایا کہ وہ دینی بزرگوں کی سرگزشت اور خاص طور سے معین ادب کے ساتھ دو جلدوں میں کتاب "داستان راستان" کو نوجوانوں کے لیے لکھا۔ باوجود اس کے کہ ان کے کام کا میدان بنیادی طور پر ادب اور خاص کر بچوں کا ادب نہ تھا۔ اس کتاب نے جوان نسل کی توجہ کو اپنی طرف بہت زیادہ مبذول کیا یہاں تک کہ ملک کے یونیسکو کی ملی کمیشن کی طرف سے سب سے زیادہ پڑھی جانے والی اور بہترین کتاب کے انعام سے نوازا گیا۔ شاید کہہ سکتے ہیں کہ یہ قدم اس زمانے کے سیاسی اجتماعی موقعیت کا سبب بنا جو دھیرے دھیرے دینی اصیل کی طرف بچوں کے ادب میں میلان اپنے لیے جگہ پیدا کی۔ بتدریج انقلاب تک جاری وساری رہی۔

انقلاب کے بعد نوجوانوں اور بچوں کے ادب نے جیسے تمام ایرانی ادبی اور تمدنی شعبے دینی تاثیر اختیار کر لی اور مادی اور غیر دینی تفکرات سے فاصلہ اختیار کرایا" کانون پرورش فکری کودکان و نوجوانان" نے تھوڑی مدت کے بعد اپنے کام کو انقلابی راستے سے شروع کر دیا، تازہ استعداد اور جوانوں کی طاقت کے جذبے کے ساتھ جو کہ انقلابی قلمرو میں دریافت ہوئے تھے۔ غربی تخلیقات کے

ترجمے کی جگہ مناسب اور جدید آثار کی نشر واشاعت اسلامی بینش کے ساتھ شروع کر دی۔

اس کے علاوہ بہت سارے قلم کار اور خصوصی ناشرین نے بھی اس میدان میں اپنا سرمایہ خرچ کیا اور اپنی اوقات کی کمی کے باوجود انقلاب کے ابتدائی سال میں اکثر جلد بازی کی صورت اختیار کر لی۔ وسیع پیمائش میں داستانی تخلیقات زیادہ آموزشی وسائل عمدہ کیفیت کے ساتھ شائع کیے جا رہے تھے۔

جنگ، حماسی بینش اور عرفانی مسائل جو اس کی پیروی میں ہم آہنگ ہوئے۔ اور اکثر قلم کاروں کی فکر و قلم کو قوت بخشی، عصر انقلاب کے بچوں کے ادبی آثار میں بھی اثر چھوڑا لیکن اس جگہ اس معاملہ نے افراط اور جلد بازی کی صورت اختیار کر لی اور بچوں کی واقعی سوچ اور طبع کی نا آشنائی کی وجہ سے تخلیقات میں چہرہ دکھایا، اس کے نتیجے اتنے کامیاب اور اہمیت کے حامل نہیں ہوئے۔ خاص طور سے کبھی کبھی ظاہری اور ہنری پہلو سے یعنی جیسے بچوں کے خاص عواطف اور زبان پر تاکید مناسب نقاشی صف آرائی اور فنی مہارت بھی بے بہرہ گئی ہے۔ آخری برسوں میں "انتشارات مدرسه" وزارت آموزش و پرورش سے منسوب رہے۔ مجلّے اور کتابیں خاص کر بچوں کی کیفیت کے ساتھ مختلف عمر کے لیے نسبتاً مطلوب سامنے آئے ہیں۔

"حوزه هنری سازمان تبلیغات اسلامی" کی کوششیں نوجوانوں اور بچوں کے متعلق آثار کی نشر واشاعت کے راستے میں خاص کر "جنگ سوره و بچه های مسجد" کے نشر واشاعت جو خود اپنے لکھے ہوئے مطبوعات کے لیے امکانات فراہم کر رہے تھے، چھٹی دہائی کے برس میں ان کی پیروی ہونے لگی۔

مجموعی طور پر نوجوانوں اور بچوں کے ادب عصر انقلاب میں روشن نکات رکھتے ہیں، مذہبی سنتوں پر تاکید کے قبیل سے ایران کے ادبیات کہن اور فرہنگ کی طرف بازگشت۔ فنی فارسی ادب کی داستانوں کی بازنویسی اور روایات و حکایات کے جاری رکھنے کی کوشش جو اسلامی تمدن سے مربوط رہی ہے اور تالیف کا رخ کرنا ترجمے کی جگہ، اس حال میں جب وہ ہنری اور فنی مجموعے میں بہت زیادہ برخوردار نہیں ہوئے اور کوئی نظارت یا کوئی خاص عمل اس کے لیے نہیں اپنایا گیا۔ اب بھی اپنے کامیاب چہرے اور واقعی راستے کو پیدا نہیں کر سکا ہے۔ ان تمام چیزوں کے باوجود زیادہ تر کامیابی اور توجہ اس سمت دی گئی ہے کہ وہ تمام خوبیاں آگے چل کر پیدا ہو سکیں۔

☆☆☆

حواشی:

۱۔ پیرای آگای از سهم کودکان در ادبیات ایران، رك: قدمعلی سرامی، "سهم کودکان در ادبیات گزشته ایران" فصلنامه کانون، دوره اول، س ۲، (تابستان ۱۳۵۳) ص۳ ۲ تا ٤۳۔

صدیقه هاشمی نسب، کودکان و ادبیات رسمی ایران، سروش، تهران ۱۳۷۱، ۳۵۱ صفحه

۲۔ برای آگاهی اجمالی از سیر ادبیات کودکان در ایران پس از مشروطه، رك: لیلی ایمن، توران میرهادی، مهدخت دولت آبادی: گذری در ادبیات کودکان، (شورای کتاب کودك، چ سوم، تهران ۱۳۵۵)، ص ۱۹ به بعد.

۳۔ رك: محسن بابایی،نقد و بررسی رمان کلیدر، ص ۲۳ به بعد

٤۔ برای بررسی اجمالی جلد اول این اثر، رك: محمود قربانی، نقد و تفسیر آثار محمود دولت آبادی، ص ۱۰۱ به بعد.

٥– برای نقد این اثر، رك: عطاء الله مهاجرانی، "وقتی ثریا نمی درخشد"،

کلك ٥٦ ٥٥، (مهر و آبان ۱۳۷۳) ص ۲٤۳ به بعد و ۲۷۷ به بعد

٦۔ پیرامون دیدگهای جامعه شناختی این رمان، رك: علی فردوسی، "آشنایی در توفان"، کلك ٥٦ – ٥٥ ص ۲٥٤ بعد.

۷۔ عابدینی، صد سال داستان نویسی ۳٥۱/۲ به بعد

۸۔ جمال میرصادقی، ادبیات داستانی، صد ٦۷٥ به بعد.

۹۔ محمدرضا قربانی، نقد و تفسیر آثار دولت آبادی، نشر آروین، تهران ۱۳۷۳، ۱۷٥ صفحه

محسن بابایی، نقد و بررسی رمان کلیدر، پایان نامه کارشناسی ارشد دانشگاه فردوسیمشهد ۱۳۷۳، ۱۹۳ صفحه

۱۰۔ رك: عابدینی صد سال داستان نویسی در ایران، ۲۸۰/۲.

۱۱۔ برای آشنایی با گلشیری و داستانهای او رك:

۱۲۔ جمال میرصادقی، ادبیات داستانی، ٦۷٦ به بعد.

۱۳۔ عابدینی، صد سال داستان نویسی، ۲۷٤/۲٤۷۲ به بعد.

۱٤۔ ابراهیم استاجی، نقد داستانهای گلشیری، پایان نامه لیسانس زبان و ادبیات فارسی، دانشگاه فردوسی مشهد ،۱۳۷.

۱٥۔ رك: جمال میرصادقی، ادبیات داستانی، ص ۲۹٦

۱٦۔ درمون: بوته ای شبیه خار ولی بی خار با برگهای سوزنی.

۱۷۔ درباره پیشینه تئاتر سنتی در ایران رك: جمشید ملك پور، ادبیات نمایشی در ایران، جلد اول، ٥۳۲ صفحه

۱۸۔ این شش نمایشنامه عبارت است از: حکایت ما ابراهیم خلیل کیماگر؛ حکایت میوزوردان حکیم نباتات و درویش مستعلی شاه جادوگر معروف؛ حکایت خرس دزد افکن؛ سرگذشت وزیرخان سراب؛ سرگذشت مرد خسیس یا حاجی قرا؛ حکایت وکلای مرافعه در شهر تبریز

۱۹۔ نوشین بعدها تجربه های نمایشی خود را در کتابی با عنوان هنر تئاتر منتشر کرد، که تاکنون چندین بار چاپ شده است.

ڈاکٹر محسن علی
Assistant Professor, Department of Persian, Jamia Millia Islamia, Delhi

داراشکوہ، سفینۃ الاولیا، اور صوفی خواتین

داراشکوہ شہزادہ ہونے کے ساتھ ساتھ صوفی منش، آزاد خیال انسان اور ایک بہترین عالم تھا، لیکن اپنے پڑدادا، جلال الدین محمد اکبر کے ایجاد کردہ دین الٰہی سے قدرے متاثر تھا۔ صوفی خیالات اور مسلک کے لحاظ سے وہ قادری سلسلے سے بیعت تھا جس نے ہندوستان میں ہندو مسلم اشتراک پر زور دیا۔ مذہبی لحاظ سے وہ وسیع الخیال اور فلسفہ وحدت الوجود پر یقین رکھتا تھا۔ بچپن میں داراشکوہ کو قرآن کی تعلیم دی گئی، فارسی علم وادب کے علاوہ کیلی گرافی کی بھی تعلیم انہیں دی گئی۔

خواتین کے حوالے سے داراشکوہ کے یہاں کئی ساری چیزیں انوکھی پائی جاتی ہیں، جیسے: داراشکوہ نے اپنی بیوی نادرہ بیگم کے لیے چند تصاویر اور خطاطی پر مشتمل ایک مرقع ترتیب دیا تھا اور بڑے ہی اہتمام کے ساتھ اپنی بیوی کے نام معنون کر کے ان کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ یہ مرقع "انڈیا آفس" لندن میں ابھی بھی موجود ہے، محققین کی ایک بڑی جماعت نے اس پر تحقیقی کام انجام دیا ہے۔ اس بابت ایک ابتدائی تعارفی مضمون ڈاکٹر سید عبداللہ چغتائی نے لکھا تھا۔ مولوی محمد شفیع نے اس مرقع کے ایک حصے کا تفصیلی تعارف کرایا۔ اس کے علاوہ مذکورہ کتاب میں بھی اس کا اجمالی تعارف موجود ہے۔

داراشکوہ کی شخصیت کا دوسری حیرت انگیز ذہنیت یہ تھی کہ اس قدر عظیم الشان سلطنت کا ولی عہد اور نہایت ہی طاقتور شہزادہ ہونے کے باوجود شاہانہ مزاج سے ان کا دور دور تک کوئی واسطہ نہیں تھا، بلکہ فقیرانہ اور درویشانہ مزاج نے انہیں اوروں سے ممتاز کر رکھا تھا۔ وہ صوفیہ کے آستانوں پر حاضری دیتے اور سادھوؤں کی کٹیوں میں جا کر قیام کیا کرتے تھے۔ ان کی طاقت اور ان کی شہزادگی نے کبھی بھی علم وعرفان کی راہ سے ان کے قدم نہیں روکے اور نہ کبھی اس میں رکاوٹ آئی۔

دارشکوہ کی زندگی اوراس عہد کی تیسری انوکھی کارکردگی یہ تھی کہ انھوں نے عہد وسطی میں موجود خواتین صوفیہ اوران کے معاشرے نیز طرز زندگی کو بڑے قریب سے دیکھا اوراس پر تسلی وتشفی بخش تخلیقی و تحقیقی کارنامہ انجام دیا۔انھوں نے اپنی کتاب ''سفینۃ الاولیا'' میں ایک مکمل باب صوفی اور بزرگ خواتین کے احوال وآثار،اوران کی شخصیت کومتعارف کرانے کے لیے مختص کردیا۔مغل بادشاہت کا یہ واحد شہزادہ تھا جسے بچپن ہی سے دانشور،صوفی اورسنیاسی کہا گیا۔

دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیاء میں متعدد صوفی خواتین کا تذکرہ کیا ہے۔دراصل جب صوفی خواتین کا ذکر آتا ہے تو حضرت رابعہ بصریہ کے نام پر اکتفا کرلیا جاتا ہے اور دوسرے ناموں کی تلاش ہی نہیں ہوتی اس لیے لوگ ان صوفی خواتین سے واقف بھی نہیں ہو پاتے ورنہ عالم اسلام کا تو ذکر کیا،خود ہمارے ملک میں ایسی خواتین کی تعداد قابل ذکر ہے جو تصوف کے سلسلے سے وابستہ رہی ہیں۔''سفینۃ الاولیاء'' میں دارا شکوہ نے چار سو سے زائد صوفیہ کی حالات زندگی کو قلم بند کیا ہے اور عمدہ تاریخی نیز دستاویزاتی سوانح حیات لکھی ہیں۔یہ سوانح حیات کوئی تحقیق برائے تحقیق نہیں ہیں بلکہ یہ حق کی تلاش اور روحانیت کی جستجو ہیں۔اس کتاب میں موجود شخصیات دارا شکوہ کے لیے آئینہ بھی ہیں۔وہ اپنے روحانی اضطراب اور اپنی بے چینی کے لیے ان شخصیات کے جلو میں راہ سکون واطمینان تلاش کرتے ہیں۔دارا شکوہ کے لیے یہ کتاب دراصل تلاش ذات کا آئینہ ہے اور اسی لیے اس میں صوفیہ کی حالات تو بہت اختصار کے ساتھ بیان کیے ہیں اور بالعموم ایسے واقعات کا تذکرہ کیا ہے جو زندگی کے کسی انقلابی پہلو سے متعلق ہوں اور اس کتاب میں صرف ان لوگوں کے حالات نہیں ہیں جو تصوف کے لیے معروف ہیں بلکہ اور بھی ائمہ اور بزرگوں کے حالات ہیں۔یعنی دارا شکوہ کے لیے روحانیت کی تلاش صرف صوفیہ کے دائرے میں محدود نہیں تھی۔بلکہ انھوں نے ہر طرح کی عظیم شخصیات میں روحانی عظمت تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے دارا شکوہ کے لیے کہ سفینۃ الاولیا دراصل سفینہ ذات کا استعارہ ہے۔انھوں نے صوفیہ کے حالات بیان کرنے سے زیادہ اپنے احوال وواردات کو سمجھنے کی کوشش میں اس کتاب کو تحریر کی تھی۔

سفینۃ الاولیاء کا آخری باب خواتین پر مشتمل ہے۔اس باب میں دارا شکوہ نے تقریباً 38 خواتین کا ذکر کیا ہے۔اس باب کو انھوں نے مزید تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔پہلے میں امہات المومنین کا

ذکر کیا ہے۔ جبکہ دوسرے حصے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بنات طاہرات کا تذکرہ ہے اور تیسرے حصہ میں ان معروف و مشہور صوفی خواتین کا ذکر ہے جن سے دارا شکوہ متاثر ہوئے ہیں۔

سفینۃ الاولیا کے اِس آخری حصے کے مشتملات میں اٹھارہ صوفی خواتین کا تذکرہ شامل ہے۔ دارا شکوہ نے اس حصے میں ایک طرف ان بزرگ شخصیات کے ساتھ اپنی گہری عقیدت و محبت کا اظہار کیا ہے تو دوسری طرف ان کی شخصیتوں میں عام انسانوں کے لیے جو اسوہ اور نمونہ ہے اس کو بھی بیان کیا ہے۔

عہد وسطی کی ایک عظیم الشان سلطنت کے ولی عہد اور شہزادے کا صوفیہ کرام، خواتین صوفیہ اور مقدس و بزرگ ہستیوں سے ایسی وابستگی اور عقیدت ایک غیر معمولی بات ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تصوف دراصل ایک عوامی رجحان ہے اس لیے ایک شہزادے کا اس سے دل چسپی لینا اور تصوف کو اپنی شناخت کے طور پر اختیار کرنا ان کے عوامی لگاؤ کا بھی غماز ہے۔

دارا شکوہ نے مذکورہ کے مشتملات میں جن عظیم خواتین کا تذکرہ شامل کیا ہے ان میں ازواج مطہرات: یعنی حضرت خدیجہؓ، حضرت عائشہ، حضرت زینب، حضرت زینب بنت جحش، حضرت سودہ، حضرت صفیہ، حضرت ام حبیبہ، حضرت حفصہ، حضرت جویریہ، حضرت میمونہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما کا تذکرہ ہے۔ بنات طیبات: یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چاروں بیٹیوں حضرت فاطمہ، حضرت زینب، حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ تعالی عنہم اجمعین کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد دوبارہ نساء عارفات کا عنوان قائم کیا ہے۔ اس میں حضرت زایدہ، حضرت شعوانہ، حضرت غفیرہ، حضرت رابعہ بصریہ، حضرت نفسہ، حضرت فاطمہ، حضرت تحفہ، حضرت ام عیسیٰ، حضرت ام محمد، حضرت آمنہ الواحد، حضرت امۃ الاسلام، حضرت میمونہ الواعظ، حضرت خدیجۃ الواعظ، حضرت ام محمد، حضرت کریمہ المروزیۃ، حضرت فاطمہ الواعظ، حضرت فاطمہ اور بی بی جمال رحمہم اللہ تعالی علیہم کا تذکرہ ہے۔

حضرت بی بی جمالؒ حضرت میاں میر قادریؒ کی بہن تھیں، ان کا بھی ذکر اس کتاب میں موجود ہے۔ مضمون تقریبا ایک ہی ہے اس لیے یہاں سکینۃ الاولیا کی عبارت نقل نہیں کی گئی ہے۔

دارا شکوہ نے یہ کتاب اپنے مزاج کے مطابق نہایت تحقیق و جستجو کے بعد لکھی ہے۔ اس کتاب کی بیشتر معلومات مستند اور معروف تذکروں سے ماخوذ ہیں۔ خاص طور پر عبدالرحمٰن جامیؒ کی کتاب نفحات الانس کو انھوں نے اپنا مصدر و منبع بنایا ہے جو تصوف کے حوالے سے ایک نہایت اہم تذکرہ ہے۔ خواتین

صوفیہ کے تذکرہ کے لیے بھی داراشکوہ نے عام طور پر اسی کتاب پر اعتماد کیا ہے۔

تصوف میں خواتین صوفیہ کی روایت تو ابتدا سے موجود ہے لیکن پہلے یہ روایت اتنی معروف نہیں تھی۔ عہد وسطی میں ویسے بھی خواتین کو ایک مقتدیٰ اور پیشوا یا اسوہ ونمونہ کے طور پر نہیں دیکھا جاتا تھا۔ لیکن داراشکوہ نے خواتین کو ایک نمونے کے طور پر دیکھا اور سمجھا۔ داراشکوہ نے ان خواتین کے جو واقعات قلم بند کیے ہیں اور زندگی کے میدان میں ان کی خدمات کو بیان کیا ہے اس سے کم از کم یہ تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ داراشکوہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ خواتین بھی ان کاموں کو انجام دے سکتی ہیں۔

داراشکوہ نے جن خواتین کا تذکرہ کیا ہے ان میں ایک حضرت شعوانہؒ ہیں۔ حضرت شعوانہؒ کے اخلاق کے ذریعے انھوں نے اس چیز کو ثابت کیا ہے کہ عورت بھی دعوت اصلاح اور وعظ ونصیحت کا کام بحسن وخوبی انجام دے سکتی ہے۔ اس کا مقام صرف گھر کی چہار دیواری کے اندر نہیں ہے بلکہ وہ روحانیت کی دنیا میں بھی اپنی منزل تلاش کرسکتی ہے اور اس تلاش وجستجو کے سارے تقاضے پورے کرسکتی ہے یعنی وہ مرید بھی بن سکتی ہے اور مرشد ورہنما بھی۔ وہ مردوں کی محفل میں وعظ بھی کرسکتی ہے اور خود بھی ان کی محفل میں حاضر ہوسکتی ہے اور دوسرے مرد اہل اللہ بھی ان سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ سفینۃ الاولیاء میں حضرت شعوانہؒ (متوفی: 175ھ مطابق) کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''وہ عجم کی رہنے والی تھیں۔ ابلہ میں قیام پذیر تھیں۔ خوش آواز تھیں اور وعظ بھی بہت اچھا کہتی تھیں۔ عابد، زاہد اور عارف ان کی مجلس میں آتے تھے۔ چونکہ وہ بہت روتی تھیں اس لیے لوگ ان سے کہتے تھے کہ آپ کے رونے سے خطرہ ہے کہ آپ اندھی نہ ہوجائیں۔ آپ فرماتی کہ دنیا میں اندھا ہونا اس سے بہتر ہے کہ آخرت میں عذاب آخرت کے ذریعہ اندھی ہوجاؤں ان کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ کوئی آنکھ محبوب کے دیدار کی مشتاق ہو اور اس میں آنسو نہ ہوں، ایسا نہیں ہوسکتا۔ حضرت فضیل بن عیاض بھی ان کی خدمت میں آتے اور ان سے دعا کے لیے کہتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت فضیل نے دعا کے لیے کہا تو انھوں نے فرمایا کہ کیا آپ کے اور خدا کے درمیان کوئی ایسا تعلق ہے کہ میں آپ کے دعا کروں اور وہ قبول ہوجائے؟ حضرت فضیل یہ سن کر چیخ پڑے اور بے ہوش ہوگئے۔''(1)

سلوک ومعرفت کے حوالے جس طرح حضرت حسن بصریؒ کا نام لیا جاتا ہے، اسی طرح خواتین صوفیہ میں حضرت رابعہ بصریہؒ کا نام لیا جاتا ہے۔ حضرت رابعہ اپنے وقت کی اور ہر زمانے کی سب سے مشہور صوفی خاتون گذری ہیں، ان کے عہد کے بہت سے علما وصلحا ان سے استفادہ کرتے تھے، امام سفیان ثوریؒ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور ان کو اپنی مؤدبہ کہتے تھے۔ اتفاق یہ ہے کہ جب بھی صوفی خواتین کا ذکر ہوتا ہے تو صرف حضرت رابعہ بصریہ کا نام لیا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں داراشکوہ نے لکھا ہے کہ:

''ابوسفیان ثوریؒ (بہت بڑے محدث اور فقیہ) ان سے مسائل دریافت کرتے تھے اور ان سے دعا کرانے کے امیدوار رہتے تھے۔'' انہی کے بارے میں لکھا ہے کہ ''ایک شخص ان کی خدمت میں آیا اس نے دیکھا کہ ان کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ اس نے عرض کیا کہ آپ کے خدام تو کثرت سے ہیں کسی کو حکم دیجیے آپ کے لیے اچھے کپڑے فراہم کردے۔ حضرت رابعہ نے جواب دیا کہ مجھے غیر سے سوال کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔''

حضرت رابعہؒ کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب ان کی وفات کا وقت قریب ہوا تو بڑی تعداد میں صوفیہ، علما اور مشائخ ان کے پاس جمع ہوگئے۔ کچھ دیر کے بعد حضرت رابعہ نے فرمایا کہ اب آپ لوگ باہر چلے جائیں اللہ کے فرستادے آرہے ہیں۔ چنانچہ لوگ باہر چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد اندر سے قرآن کی ایک آیت پڑھنے کی آواز آئی جس کا مطلب ہے 'اے نفس مطمئنہ تو اپنے رب کی طرف لوٹ جا اس حال میں کہ خدا تجھ سے راضی ہے اور تو خدا سے راضی ہے۔ پس میرے بندوں میں داخل ہوجا اور میری جنت میں داخل ہوجا'۔ جب لوگوں نے یہ آواز سنی تو اندر گئے لیکن اس وقت تک حضرت رابعہ کا انتقال ہوچکا تھا۔(2)

ایک عظیم صوفی اور محدث خاتون حضرت نفیسہؒ تھیں۔ داراشکوہ نے ان کے ذکر میں ان کی عظمتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''وہ حدیث کی بہت بڑی امام تھیں اور ان کے زمانے کے بڑے بڑے علما بھی ان سے حدیث پڑھنے جاتے تھے۔ فقہ کے چار اماموں میں سے ایک امام یعنی حضرت

امام شافعی بھی جب مصر گئے تو ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے حدیث پڑھی۔ وہ مصر میں اتنی مقبول شخصیت تھیں کہ جب ان کا انتقال ہو گیا تو ان کے شوہر نے خواہش کی کہ ان کی میت کو مدینہ لا کر دفن کریں، لیکن اہل مصر نے جمع ہو کر ان سے درخواست کی اور ان کو راضی کیا کہ اس عظیم محدثہ کا جنازہ مصر میں ہی دفن کیا جائے۔ ان کا انتقال 208ھ میں رمضان المبارک کے مہینے میں ہوا تھا۔" (3)

داراشکوہ کے اس واقعہ سے دو باتیں بالکل واضح ہو جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کی نظر میں ایک خاتون اتنی عظیم محدثہ ہو سکتی ہے کہ اپنے وقت کا امام بھی ان کا شاگرد ہو۔ دوسری بات یہ کہ وہ عورت ہونے کے باوجود مردوں کو پڑھاتی تھیں اور عوام میں میں اتنی مقبول تھیں کہ لوگوں نے ان کے جنازے کو مصر کے باہر نہیں جانے دیا۔ گویا وہ ہر دور کی عورتوں کے لیے ایک اسوہ و نمونہ تھیں۔

داراشکوہ حضرت تحفہؒ کی حالات زندگی پر بھی بہت تفصیل سے لکھے ہیں۔ حضرت تحفہ سے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ حضرت سری السقطی کے عہد میں تھی اور باندی تھیں۔ عشق الٰہی میں دیوانی ہو گئی تھیں اس لیے ان کا مالک ان کو باندھ کر رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ ادھر سے سری السقطیؒ کا گزر ہوا، حضرت سریؒ سے اس کی گفتگو ہوئی۔ حضرت سریؒ کو ان کے مقامات کا احساس ہوا تو حضرت سری نے اپنے دوست کے ذریعہ اس کو خرید کر آزاد کرنا چاہا لیکن اس دوران خود مالک کو بھی ان کے مقامات کا احساس ہو گیا تھا اس لیے اس نے خود ہی ان کو آزاد کر دیا تھا اور وہ ان سے اتنا متاثر ہو گیا تھا کہ اس نے اپنا گھر بار، مال و دولت سب غریبوں میں تقسیم کر دیا اور خود بھی تصوف کا راستہ اختیار کر لیا۔ (4)

حضرت فاطمہ نیشاپوریؒ بھی اپنے وقت کی ایک عظیم صوفی اور عالم گزری ہیں۔ ان کے بارے میں بھی داراشکوہ نے بہت ہی عمدہ کلمات لکھے ہیں وہ قرآن کی بھی بڑی عالم تھیں اور تفسیر قرآن کا درس دیا کرتی تھیں۔ ان کا تفسیر بیان کرنے کا انداز بہت ہی نرالہ اور اچھوتا تھا ان کے تفسیر کے درس میں مرد اور عورتیں برابر دونوں شریک ہوتے تھے۔ داراشکوہ نے لکھا ہے کہ:

"حضرت فاطمہ نیشاپوری مکہ مکرمہ میں کعبہ کی مجاور اور خادم تھیں۔ کبھی کبھی بیت المقدس کی زیارت کے لیے بھی جاتی تھیں۔ سلطان العارفین ضحرت بایزید آپ کی بے حد تعریف کیا کرتے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ میں عمر بھر میں صرف ایک عورت

اور مرد کو ہی دیکھا ہے جو میری نظر میں کامل تھے۔عورتوں میں جس کو صاحب کمال پایا وہ فاطمہ نیشاپوری ہیں۔کسی مقام پر کوئی بات ہو وہ آپ پر منکشف ہو جاتی تھی۔مشائخ میں سے کسی کی ملاقات حضرت ذوالنون مصری سے ہوئی انھوں نے ان سے دریافت کیا کہ آک کے دور میں سب سے بزرگ کون ہے فرمایا کہ مکہ میں ایک عورت ہے جسے فاطمہ نیشاپور کہتے ہیں۔وہ قرآن مجید کی تفسیر اور اس کے حقائق ومعارف کا بیان اس خوش اسلوبی سے کرتی ہیں کہ مجھے ان پر رشک آتا ہے۔یعنی وہ سب سے بزرگ ہیں۔ایک روایت یہ ہے کہ ایک دن حضرت فاطمہ نے شیخ ذوالنون مصری کے لیے کوئی چیز بطور نذرانہ بھیجی،انھوں نے فرمایا کہ عورتوں سے ہدایا وتحائف قبول کرنا ذلت ونقصان کا باعث ہے۔حضرت فاطمہ نے فرمایا کہ کوئی صوفی اتنا بلند نہیں ہوا کہ سبب اور واسطہ سے بلند ہو کر دیکھ سکے۔(5)

حضرت ذوالنون مصری علیہ الرحمۃ کی تعریض اس دور کی ہوگی جب وہ حضرت فاطمہؒ کے مقامات ان پر منکشف نہ ہوئے ہوں گے۔بعد جب ان کو انکے مقامات کا علم ہوا تو ان کے عقیدت منداور گرویدہ ہو گئے۔

داراشکوہ نے ایک ایسی صوفی خاتون کا بھی ذکر کیا ہے جو فقہ اور قانون میں کافی ماہر تھیں اور باضابطہ ومسلسل فتوے بھی دیا کرتی تھیں۔ان کا نام ام عیسیٰؒ تھا۔ان کے بارے لکھا ہے کہ حضرت ام عیسی بڑی عارفہ تھیں اور فقہ کی ماہر تھیں۔ان کا انتقال 328ھ میں ہوا۔(6) ایک اور خاتون صوفی جن کا نام ستیتہؒ تھا ان کا بھی اس کتاب میں تذکرہ کیا گیا ہے۔حضرت ستیتہؒ ام احد کے نام سے بھی مشہور تھیں۔وہ فقہ اور ریاضی کی ماہر تھیں علم میراث میں ان کو کمال حاصل تھا۔یعنی وہ دینی ودنیاوی علوم میں مہارت رکھتی تھیں۔377ھ میں ان کا انتقال ہوا۔(7) داراشکوہ نے ایک اور صوفی خاتون امۃ الاسلامؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ خود تو محمد بن اسمٰعیل بصلائیؒ کی شاگردہ تھیں اور حضرت تنوخی،حضرت زاہدی اور حضرت ابوعلی ان کے شاگرد تھے۔(8) یعنی انھوں نے ایک مرد سے علم حاصل کیا تھا اور متعدد مردوں نے بھی ان کی خدمت میں حاضر ہو کر علم حاصل کیا تھا۔اس کے علاوہ بعض دیگر صوفی خواتین کے متعلق لکھا ہے کہ وہ یا تو مرد صوفیہ کی مرید تھیں یا مرد

صوفیہ ان کے مرید تھے۔اسی طرح بعض صوفی خواتین کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ عوامی مقامات پر تقریریں کرتی تھیں اور وعظ ونصیحت بھی کیا کرتی تھیں۔اسی طرح بعض صوفی خواتین کے بارے میں تحریر ہے کہ وہ عوامی جگہوں پر اشعار سناتی تھیں اور عوام ان کو سنتے تھے۔راہ سلوک کے ماہرین اور عارفین پر ان اشعار کے اثرات بھی ہوتے تھے۔یہ اشعار عام طور پر عشق الٰہی کی کیفیات سے سرشار ہوتے تھے۔(9)

حضرت شعوانہؒ ایک عظیم صوفی اور عابدہ خاتون تھیں وہ بہت رونے والی اور محنت ومجاہدہ کرنے والی تھیں۔داراشکوہ نے عہد وسطیٰ کے معاشرے میں حضرت شعوانہؒ اور اس دور کی دیگر صوفی خواتین کے جو حالات لکھے ہیں وہ ان کی نظر میں نسائی جہت کے نئے گوشوں کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔اس دور کی صوفی خواتین کی بارگاہ میں ارباب القلوب ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔صوفی خواتین کی مجلس میں مرد صوفیہ کا آنا،ان کا وعظ سننا،ان سے دعا کی درخواست کرنا اور ان کے ملفوظات کو نقل کرنا،یہ بغیر اختلاط کے نہیں ہوسکتا اور داراشکوہ کے عہد میں یہ اختلاط کسی مقام پر ممکن نہیں تھا۔

داراشکوہ نے مذکورہ کتاب میں اس طرح کی کئی خواتین کا تذکرہ کیا ہے جو اپنے وقت کی جید عالمہ اور صوفیہ تھیں ان کے فضل وکمال اور زہد وتقویٰ کو سب تسلیم کرتے تھے۔ان میں سے کچھ ایسی صوفیہ تھیں تھیں جو باضابطہ مرد صوفیا سے مرید تھیں اور کچھ ایسی تھیں جن کے مرید بھی مرد صوفیا تھے۔کچھ ایسی بھی تھیں جو صرف عورتوں میں ہی دعوت وتبلیغ اور سلوک ومعرفت کی تعلیم دیا کرتی تھیں۔غرض داراشکوہ نے اس کتاب کے ذریعے یہ بتانے کی مکمل کوشش کی کہ عہد وسطی میں بھی خواتین کا معاشرے میں ایک مستقل کردار تھا۔

سفینۃ الاولیا میں داراشکوہ نے جس طرح مرد حضرات میں روحانی عظمت کی روایت کو عہد نبوی سے لے کر اپنے زمانے تک لکھا ہے اسی طرح خواتین کی روحانی عظمت کی روایت کو بھی عہد نبوی سے لے کر اپنے زمانے تک لکھا ہے،یعنی ان کی نظر میں خواتین کی عظمت محض کوئی تاریخی کردار نہیں تھا بلکہ معاشرے کا ایک اہن حصہ تھا۔اس کتاب کی تصنیف کے وقت بھی حضرت میاں میر کی بہن حضرت بی بی جمال خاتون نمائندگی کرتی تھیں۔

داراشکوہ نے اس کتاب کے آخر میں اپنے روحانی مرشد حضرت میاں میر قادریؒ کی بہن بی بی جمال خاتونؒ کا بھی ذکر کیا ہے۔یعنی ان کے کچھ اہم کرامات کا بھی ذکر ہے۔حضرت بی

بی جمال 1049ھ یعنی اس کتاب کے لکھے جانے تک باحیات تھیں۔(10)

داراشکوہ نے اس کتاب میں سب سے اہم کام یہ کیا ہے کہ اکثر خواتین کی تاریخ وفات کو درج کر دیا ہے۔اس سے ان کے زمانے کا تعین آسانی ہو جاتا ہے۔داراشکوہ نے صوفی خواتین کا تذکرہ لکھ کر ایک غیر معمولی خدمات انجام دی ہے انھوں نے اس کتاب کے توسط سے یہ پیغام عام کیا ہے کہ خواتین کے لیے جس طرح روحانی عظمت کا حصول ایک تاریخی روایت ہے یعنی عہد نبوی سے قائم ہے اسی طرح اس کے مواقع آج بھی موجود ہیں۔مجموعی طور پر شہزادہ داراشکوہ نے آنحضرت ﷺ سے لیکر حضرت بی بی جمال خاتونؒ تک کے مختصر سوانحی حالات کو اپنے مخصوص متصوفانہ طرز تحریر سے قلمبند کئے ہیں۔خصوصی طور پر آخری حصہ میں خواتین صوفیا کے تذکرے سے مذکورہ دونوں تصنیف می خواتین صوفیہ کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے جس سے اس دور کے صوفیہ خواتین کے اندر کے متصوفانہ اسرار و رموز کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔

☆☆☆

حواشی:

1۔داراشکوہ:سفینۃ الاولیا،مطبع نامی،نول کشور،کان پور،طبع 1882 ص:207

2۔ایضا

3۔ایضا،ص:209

4۔ایضا،ص:209-212

5۔ایضا،ص:209

6۔ایضا،ص:212-213

7۔ایضا،ص:213

8۔ایضا

9۔ایضا،ص:214

215۔ایضا،ص:10

محمد فہیم احمد

Research Scholar, MLSU, Udaipur, Rajasthan

کوٹہ میں اردو شاعری

ریاست کوٹہ کی بنیاد سترہویں صدی عیسوی میں عہد جہانگیری کے دوران راؤ مادھوسنگھ ہاڑا (۱۵۹۹ء۔ ۱۶۴۸ء) نے ۱۶۳۲ء میں رکھی تھی۔ یہ ریاست ابتدا میں ریاست بوندی کا حصہ تھی۔ راؤ مادھوسنگھ بوندی کے راجا رتن سنگھ کا دوسرا بیٹا تھا۔ اس ریاست کے راجاؤں کو مہاراؤ کا خطاب ملا تھا۔ مہاراؤ بھیم سنگھ اول (ولادت: ۱۶۸۲ء۔ وفات: ۱۷۲۰ء) نے مغل حکومت سے پانچ ہزاری منصب پایا۔ ۲۶ دسمبر ۱۸۱۷ء کو یہ ریاست انگریز حکومت کے ماتحت آ گئی۔ ۱۸۲۲ء میں حکومت انگلشیہ نے اردو کو دفتری زبان بنانے کا ملک گیر اعلان کر دیا۔ المیہ یہ ہوا کہ اردو کی ترقی غدر کے ہنگاموں کے فرو ہونے کے بعد ہی ہو سکی جب راجپوتانہ کے باہر سے اردو داں حضرات کی آمد و رفت شروع ہوئی۔

دیگر دبستانوں کی طرح کوٹہ بھی ادبی حوالے سے زرخیز خطہ رہا ہے۔ دریائے چمبل کے کنارے بسا ہوا یہ خوبصورت شہر مقامی و غیر مقامی نامور ادباء و شعراء اور فنکاروں کا مسکن رہا ہے جنھوں نے اس کا نام دنیا بھر میں روشن کیا۔ راجستھان کے پٹھاری خطہ کوٹہ کے حوالے سے احتشام اختر کا یہ شعر زبان زد خاص و عام ہے۔

ندی کا ہے یہ کرشمہ جو ہو گئی رونق کہ ریگزار میں مثل بہار ہے کوٹہ

کوٹہ میں اردو زبان و ادب کی ترقی میں بیرونی شعراء و ادباء کا رول بھی اہم ہے۔ اس فہرست میں منشی فیاض الدین احمد فدا (تلمیذ: غلام محمد رہا اکبر آبادی) عبداللطیف یکتا (تلمیذ: انور دہلوی، داغ دہلوی) افضل حسین ثابت (تلمیذ: اوج لکھنوی و امیر مینائی) سید محمد حسن ثاقب دہلوی (تلمیذ ذکی دہلوی تلمیذ غالب) مذاق بدایونی، ریاض الحسن ریاض تھراوی، عبدالقادر ندا اکبر آبادی، ہیرالال سود شیدا اکبر آبادی، حکیم سید احمد حسین لکھنوی، مولوی مظہر الہادی امروہوی وغیرہ کی شمولیت ہے جن کا تذکرہ حیاتِ دبیر میں کیا گیا ہے۔ کوٹہ

میں ۱۸۵۷ء کے بعد کا عہد اردو شاعری کی ارتقا کے باب میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ دلّی اجڑی، لکھنؤ، رامپور اور حیدرآباد ریاستیں آباد ہوئیں۔ ان کے انتشار کے بعد مزید چھوٹی بڑی ریاستیں مہاجرین اردو کی آماجگاہ بنیں۔ راجستھان کے دیگر خطّوں کی طرح کوٹہ بھی اجڑے دیار کے لوگوں سے آباد ہوگیا۔ بقول دیانرائن نگم:

> غدر کے بعد انگریزوں کی ایما پر نواب فیض علی خاں کوٹہ کے وزیر اعظم مامور ہوئے اور ریاست کے دفاتر میں اردو زبان استعمال کی جانے لگی۔ ۱۸۵۷ء میں مطبع فیض کے نام سے پریس قائم ہوا۔ اس پریس پر سرکاری قوانین اردو اور دیوناگری رسم الخط میں شائع کیے جاتے تھے۔ اس دوران ریاست کے سرکاری ملازمین میں ایسے حضرات شامل ہوئے جن کو شعر و سخن کا شوق تھا۔[۱]

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ نواب فیض علی خاں جب کوٹہ کے وزیر اعظم مقرر ہوئے تو اردو ادب کو ترقی و ترویج ملی۔ دراصل کوٹہ میں اردو کی آمد اور اس کے استحکام کا سہرا بھی ان ہی کے سر جاتا ہے۔ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ ادبی سطح پر کوٹہ میں اردو اُس وقت عام ہوئی جب حاجی سید جعفر حسین (سیشن جج کوٹہ) کے ہمراہ منشی افضل حسین ثابتؔ لکھنوی نے یہاں کی بود و باش اختیار کی۔ کوٹہ کی ادبی فضا کو خوشگوار بنانے میں نواب فیض علی خاں کے شانہ بہ شانہ ثابتؔ لکھنوی کی خدمات بھی ہیں۔ ان کے علاوہ تلامذہ غالبؔ کے طور پر منشی گوبند سہائے نشاطؔ الہ آبادی بہ حیثیت سیشن جج اور محسن الدولہ سفیر الملک نواب سید محمد جمشید علی خاں جمؔ حاکم بن کر کوٹہ میں وارد ہوئے۔ اس سے ازخود ادبی سرگرمیاں تیز تر ہوگئیں۔ ۱۸۸۰ء میں کوٹہ کے افق شاعری پہ جگمگانے والا اولین ستارہ ثابتؔ لکھنوی تھے جنھوں نے باقاعدہ طور پر کوٹہ میں اردو شعراء کا حلقہ تیار کیا۔ کوٹہ کے استاد شاعر مفتیؔ کوٹوی اپنے مضمون ''ثابتؔ لکھنوی مرحوم کی ضیاپاشیاں'' میں رقم طراز ہیں:

> ثابتؔ مرحوم ۱۸۶۲ء میں بمقام لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے مابعد نے انھیں معاشی ضرورتوں کے تحت ترک وطن پہ مجبور کیا۔ ۱۸۸۰ء میں بہ عمر ۱۸ سال کوٹہ راجستھان آئے۔ پہلے سرکاری ملازمت سے وابستہ رہے، بعد ازاں وکالت شروع کردی۔ ریاست کوٹہ سے انھیں وظیفہ ادبی بھی ملتا تھا اور دربار میں ان کی نشست بھی مقرر تھی۔ حیات دبیر حصہ اول و دوم اور دربار حسین ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ خود اُن

کے اعزائی اصناف کا مجموعہ صبر جمیل (تاریخی نام برق غم) شائع ہو چکا ہے۔ حالانکہ انھوں نے کافی غزلیں، نظمیں اور رباعیات کہی ہیں۔ شاید حوادث روزگار کی زد میں آ گئیں ۱۹۴۷ء کا طوفان انھیں بھی کہیں اُڑا لے گیا۔ یہ (ثابتؔ لکھنوی) ۱۹۴۱ء میں بہ عمر ۷۹ سال رحلت فرما گئے۔ کوٹہ ہی میں پیوند خاک ہوئے۔[۲]

ثابتؔ لکھنوی دبستان لکھنؤ سے بلاواسطہ اور دبستان دبیر سے بالواسطہ مرزا اوجؔ لکھنوی سے وابستہ تھے۔ ثابت لکھنوی اپنے کلام پر اوجؔ لکھنوی سے اصلاح لیتے تھے اور دیگر اصناف سخن میں امیر مینائی سے مشورہ سخن فرماتے تھے۔ ان کی قابل قدر تصنیف 'حیات دبیر' شبلی نعمانی کی 'موازنہ انیس و دبیر' کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ راجستھان کی ادبی تاریخ کے مطالعے سے اب تک کی تحقیق کی روشنی میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ کوٹہ میں اردو شاعری کے لیے ۱۸۷۳ء سے ۱۸۷۹ء تک فضا سازگار رہی۔ اور باقاعدہ طور پر آغاز ۱۸۸۰ء ثابتؔ لکھنوی کی تشریف آوری سے ہوا۔ یہ بڑے قادرالکلام شاعر تھے۔ غزل اور مرثیہ میں انھیں ید طولی حاصل تھا۔ ثابتؔ لکھنوی کے اثرات سے کوٹہ میں شاعری کے افق پہ کئی تلامذہ ابھر کر سامنے آئے جنھوں نے آگے چل کر کوٹہ میں اردو شاعری کی مشعل کو فروزاں کیا۔ ایسے شعراء میں بابو بال مکند گپتؔ، مفتوںؔ کوٹوی، سراجؔ کوٹوی، تمکینؔ کوٹوی اور عبدالعظیم بسملؔ اکبر آبادی قابل ذکر ہیں۔ اس طرح استادی شاگردی کی روایت کے زیر اثر کوٹہ میں اردو شاعری پروان چڑھی۔ ثابتؔ لکھنوی کے مشن کو مفتوںؔ کوٹوی نے عام کیا۔ کوٹہ اور اطراف کوٹہ میں شعراء کی کثیر تعداد نے اس تربیت میں حصہ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ مفتوںؔ کوٹوی کے تلامذہ کی طویل فہرست ہے۔ ثابتؔ لکھنوی کی کاوشوں کی بدولت کوٹہ کی ادبی نشستوں کو جو عروج حاصل ہوا انھوں نے اس حوالے سے ایک جگہ لکھا ہے۔

شروع شروع میں یہ ادبی محفلیں سید کا باغ، سیٹھ کنولال نوہرا اور راج کنہاری کی حویلی میں منعقد ہوتی تھیں۔ خاص نشستوں میں ثابتؔ لکھنوی، سہیلؔ امروہوی اور وکیل محمد ثاقبؔ شریک ہوتے تھے۔[۳]

بیسویں صدی کے نصف اول میں یہاں اردو زبان و ادب کو عروج حاصل تھا۔ ہر خاص و عام اس کا والہ و شیدا تھا۔ جب کوٹہ میں باقاعدہ شعر و شاعری کا آغاز ہو گیا تو تیزی سے ادبی انجمنوں کی تشکیل ہونے لگی۔ شعری نشستوں اور مشاعروں کا انعقاد ہونے لگا۔ ان میں ہربرٹ کالج کوٹہ کے سالانہ ڈنر پر منعقد ہونے والی شعری نشستیں، مشاعرہ ریلوے انسٹی ٹیوٹ کوٹہ، بزم ادب کوٹہ، ہندی اردو پوئٹس

ایسوسی ایشن، ہربرٹ کالج کوٹہ، مشاعرہ ہربرٹ کالج (ورلڈ ایسوسی ایشن کوٹہ) فی البدیہہ مشاعرہ، میلہ دسہرہ کے موقعے پر ہونے والے سالانہ مشاعرے، جشن قیس، ہندی اردو سنگم مشاعرے اور بزم سخن کے زیر اہتمام ہونے والے مشاعروں سے یہاں کی ادبی فضا جگمگا اُٹھی۔

کوٹہ کے استاد شاعر مفتوں کوٹوی نے اپنے مضمون 'کوٹہ میں اردو' میں لکھا ہے کہ ۱۹۳۰ء کوٹہ کے راجا بھیم سنگھ کی شادی کے سلسلے میں سہرے اور قصائد لکھے گئے۔ مارچ ۱۹۳۰ء میں ان کا ایک مجموعہ شائع کیا گیا۔ مذکورہ مشاعرے میں شرکت کرنے والے شعراء کی تعداد اور نام کوٹہ کی علمی و ادبی حیثیت کو واضح کر دیتی ہے۔ بحیثیت مجموعی ۱۸۵۷ء تا حال کوٹہ میں ادباء و شعراء کی چار نسلیں سرگرم نظر آتی ہیں جن کی درجہ بندی مقامی و غیر مقامی سطح پر کی جا سکتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد شعرائے کوٹہ میں مفتوںؔ کوٹوی، ڈم ڈمؔ کوٹوی، روشنؔ کوٹوی، توفیقؔ کوٹوی، امینؔ نشاطی، عزیزؔ سانگرولی، راغبؔ کوٹوی، قیسؔ کوٹوی، تمکینؔ کوٹوی، جوہرؔ کوٹوی، عبداللطیف کوٹوی، عبدالستار عبدؔ اور حافظ حکمت علی حکمتؔ کا نام بطور خاص لیا جا سکتا ہے۔ مابعد آزادی کے شعراء میں ظفرؔ غوری، ظفر احمد پروازؔ، عقیل شاداںؔ، بشیر احمد لطفی، امین الدین اثرؔ، آزادؔ ارمی، شکورؔ انور، رؤف اخترؔ، جلال توقیرؔ، عبدالحمید حیرانؔ، امیر محمد صابرؔ، سعیدؔ محوی، مضطرؔ صدیقی، یقین الدین یقینؔ، نارائن لال گوڑشیلؔ اور دیگر اس قافلے کے سابقون الاولون ہیں۔ تیسری نسل سے تعلق رکھنے والے شعراء وہ ہیں جن کا وطن اگرچہ کوٹہ نہیں تھا لیکن ملازمت اور طویل قیام کی وجہ سے انھوں نے اسے وطن ثانی بنایا۔ ایسے شعراء میں ثابتؔ لکھنوی، للتا پرساد شادؔ میرٹھی، بہارؔ صدیقی، فضاؔ جوکالوی، احتشام اختر، فاروقؔ بخشی، عبدالجبار واہیؔ، راہیؔ ٹونکی، اکرامؔ راجستھانی، فاروق انجینئر اور کنور جاوید کے نام قابل ذکر ہیں۔ شعراء کی جدید نسل میں فرخؔ ندیم، نعیم دانشؔ، احمد سراجؔ فاروقی، یوسف رازؔ، چاند شعریؔ، جمیل قریشی، سلیمؔ آفریدی، سلیم عباسی، ڈاکٹر فرید خان، ڈاکٹر زیبا، عزیز ناچیزؔ، الیاس نازؔ، غلام مصطفیٰ، اطہر اجینی اور بشیر احمد میوؔخ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ قدیم و جدید شعرائے کوٹہ کا کلام بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

کم ظرف سے نہ مانگ کہ ثابت نہ ہو دلیل — قطرہ بھی نام کو نہیں جام حباب میں
ثابتؔ لکھنوی

غیر کیا جانیں کیا راز ہے اس میں پنہاں — آنکھ سے آنکھ جو محفل میں لڑی جاتی ہے
للتا پرساد شادؔ میرٹھی

بات باتوں سے بنتی ہے قاصد اپنی جانب سے کچھ کہا ہوتا
فضاؔ جوکالوی

مری بربادیاں دیکھی ہیں میں نے خوب اے جوہر مرے آگ جلایا جارہا تھا آشیاں میرا
جوہرؔ کوٹوی

ہر ایک سمت اندھیرا دکھائی دیتا ہے تمھاری بزم میں کیسے چراغ جلتے ہیں
پرکاش چندچاندؔ مظفرنگری

سوزِغم حیات کے نغمے مچل گئے پوچھا کسی نے حال تو آنسو نکل گئے
عبدالکریم شادؔ کوٹوی

مفتوںؔ ہمارے شعر پہ ہوگا یہ سخت ظلم پہنچے اگر نہ چشمِ سخن داں کے سامنے
مفتوںؔ کوٹوی

جب میرے گھرنے آگ پکڑی تھی ملنے آیا تھا وہ ہوا کی طرح
عقیل شاداںؔ

سینکڑوں ظلمت کدوں کو توڑ کر آئے گا پھر اک نیا سورج جو مضطرؔ شب کے پیراہن میں ہے
مضطرؔ صدیقی

بھاری بھرکم پیڑ اکھڑتے جاتے ہیں کیسے کیسے لوگ بچھڑتے جاتے ہیں
فاروقؔ بخشی

تو نہ امرت کا پیالا دے ہمیں صرف روٹی کا نوالا دے ہمیں
چاند شعری

ماقبل آزادی ومابعد آزادی کوٹہ میں ادبی سرگرمیاں سرد رہیں۔اس کی وجہ ۱۹۴۷ء کے ناسازگار حالات تھے۔اس سے کوٹہ کی ادبی فضا بھی خاصی متاثر رہی۔اس جمود کا خاتمہ ۱۹۶۰ء میں مابعد جدیدیت کی بدولت ہوا۔ایک بار پھر سے ادبی نشستوں کا انعقاد ہوا اور شعراء کی محفلیں آباد ہونے لگیں۔اس زمانے کی نشستوں میں باہر کے شعراء کو مدعو کیا جاتا تھا۔بقول احتشام اخترؔ کوٹہ کے بارے میں ایک خاص بات قابل ذکر ہے کہ کوٹہ کے ادبی ماحول پر کبھی جمود طاری نہیں ہوا۔کوٹہ کے نوجوان شعراء اپنے پیش رو شعراء سے زیادہ سرگرم عمل اور فعال ہیں۔کوٹہ جیسے صنعتی شہر میں رہنے والے نوجوان شعراء کی فکر بھی جدید اور سائنٹفک ہے۔

ان کی فکران کی شاعری میں بھی منعکس ہوتی ہے۔[۴]

ریاست کوٹہ کا علمی وادبی سفر مختلف نشیب وفراز سے گزر کر ارتقا کی جانب گامزن ہے۔ عہد گزشتہ کے ادباء وشعراء نے نئی نسل کے لیے جو راہیں ہموار کی ہیں ان پر چل کر ہی نسل نو نے روایات کو زندہ وتابندہ رکھا ہے۔

☆☆☆

مراجع ومصادر:

۱۔ ماہنامہ زمانہ کانپور دسمبر ۱۹۴۳ء صفحہ ۲۸۶

۲۔ سہ ماہی نخلستان اودے پور راجستھان، شمارہ ۱، ۲۔ اشاعت: اپریل و جولائی ۱۹۶۴ء

۳۔ مضمون: راجستھان میں فروغ اردو کا صد سالہ جائزہ۔ رسالہ اردو ادب علی گڑھ صفحہ ۸۳۔ اشاعت: ۱۹۶۶ء

۴۔ انداز نظر۔ مضمون۔ کوٹہ کا جدید شعری ادب: ایک جائزہ۔ صفحہ ۴۴۔ اشاعت ۲۰۱۰ء

ڈاکٹر غوث احمد شیخ
Assistant Professor, S. S. A, Arts and Comerse College, Solapur, Maharashtra

خلیق الزماں نصرتؔ: محقق، نقاد اور شاعر

ملخص

نصرت صاحب کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جس نے اپنی محنت ولگن سے اردو ادب کے لیے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ انہوں نے تنقیدی پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے شعرا کے اشعار کا اچھا انتخاب کیا ہے۔ اس سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے تنقید کے گھسے پٹے جملوں کا استعمال نہیں کیا ہے۔ ان کے دو تنقیدی مضامین کے مجموعے (۱) آخری گھڑے کا پانی (۲) آب مقطہ شائع ہو چکے ہیں۔ نصرتؔ صاحب تنقیدی مضامین لکھنے کے دوران ہی تحقیقی نظریے سے بھی چیزوں کو دیکھا کرتے ہیں۔ ابتداء میں انہوں نے ایک مضمون جو کافی طویل ہے ''اردو وادی خار'' میں لکھا تھا۔ اس سے ان کی زبان اور تحقیق کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے مضامین کا شکل میں تذکرہ بھی لکھا۔ بڑے اور اچھے شاعروں پر کافی مواد اکھٹا کیا۔ تحقیق کا ایک نایاب نمونہ خلیق الزماں نصرتؔ کی مایہ ناز کتاب ''برمحل اشعار اور ان کے مآخذ'' ہے۔ اس کا ذکر ہندوستان ہی نہیں بیرون ہندوستان میں ہو رہا ہے۔ عرصے تک ان کو لوگ شعر کے خالق کا نام جاننے کے لیے فون کرتے تھے اور ان سے رابطہ کرتے تھے۔ اسی طرح ان کی ''تذکرہ شعرائے مہاراشٹر'' جلد اول اور دوم شائع ہوئیں۔ یہ ۹۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ایک ادبی دستاویز ہے۔

نصرتؔ صاحب نے تقریباً پندرہ سو اشعار کو برمحل چن کر ان کو نامعلوم ہونے سے بچالیا ہے۔ اور لگ بھگ دو ہزار اشعار اور جو دوسری جلد اور مشہور اشعار گم نام شاعر جلد اول اور دوم غیر مطبوعہ میں شامل ہے یہ اپنے آپ میں ایک ریکارڈ ہے۔ انہوں نے شمار گمنام شاعروں کو قارئین سے روشناس کرایا ہے۔

اردوادب میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جو اپنے تن من دھن سے اردو کی خدمت کرتے آرہے ہیں۔انہیں اس بات کی پرواہ نہیں کہ لوگ ان کی خدمات کے صلے میں ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں یا نہیں کرتے ہیں۔خلیق الزماں نصرت صاحب ان میں ایک ہیں۔انہوں نے ایم۔اے۔ایم۔کام کی سند لینے کے بعد ۳۲ سال تک بینک کی سروس کی۔اسکول میں آٹھویں جماعت سے شاعری کی شروعات اور بینک میں کام کرنے کے دوران شعروادب سے ناطہ نہیں توڑا۔بینک میں اردو کا کوئی کام نہیں ہوتا ہے۔ کالج میں چھوٹے چھوٹے مضامین لکھنے شروع کیے جو پیام تعلیم میں شائع ہوئے۔غزلیں صدائے عام، اردو ٹائمز اور نقش کوکن میں شائع ہوتی رہیں۔کالج کے زمانے میں بزم اردو کی ماہانہ نشستوں میں آپ نہ صرف اپنی غزل سنایا کرتے تھے بلکہ اپنے کامرس کے دوستوں کو بھی اس میں شامل کرنے کی تک ودو کی۔ جس کے نتیجے میں ان کے کئی ہم جماعت دوستوں میں شعروشاعری کا چسکا لگ گیا اور وہ ماہانہ نشستوں کے علاوہ شہر کے بڑے بڑے مشاعروں میں منتظمین کی حیثیت سے شامل ہونے لگے۔نصرت صاحب جس کالونی میں رہتے تھے وہاں اپنے بزرگوں سے مل کر ایک بزم کی شروعات کی، یہاں بھی ماہانہ شعری نشست ہونے لگی۔کچھ دنوں بعد اسی بزم کے زیر اہتمام کئی آل انڈیا مشاعرے بھی منعقد ہوئے۔نصرتؔ صاحب تعلیم مکمل کر کے بھیونڈی آئے تو یہاں مشہور شاعر اور نوائے سروش رسالہ کے مدیر حضرت فیض نظام پوری کے قریب آئے۔اور اپنی تخلیقات پر ان سے اصلاح لینی شروع کی۔ان کے استاد فیض نظامپوری کا ایک شعری مجموعہ ''مضراب'' شائع ہو چکا تھا جسے بمبئی اور اس کے اطراف میں مقبولیت مل چکی تھی۔انہوں نے بھیونڈی میں اپنی شعری صلاحیت کو خوب ابھارا۔فیضؔ صاحب جو خود بھی زبان داں تھے اور علامہ آرزو لکھنوی کے شعری خانوادے سے تھے بڑے متحرک تھے۔ان کے ساتھ رہ کر نصرتؔ صاحب نے اردو کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔نصرتؔ صاحب نے ایک ملاقات میں اپنے استاد کے تعلق میں بتایا تھا کہ فیضؔ صاحب اور ان کے استاد بیتاب نظامپوری اکثر بسمہ اللہ ہوٹل بھیونڈی میں ایک کنارے کے بنچ پر بیٹھا کرتے تھے۔فیضؔ صاحب کسی مصرعے پر شعر کہتے جاتے تھے اور ان کے استاد شعر کی باریکیاں بتا کر اشعار پھاڑ پھاڑ کر پھینکتے جاتے تھے۔اس طرح جب فیضؔ صاحب ایک مصرعے پر ۸۰۔۷۵ اشعار کہہ لیتے تھے تو آخری کے ساتھ آٹھ شعر کو بیتاب نظام پوری انہیں سنبھال کر رکھنے کی ہدایت دے کر وہاں سے اٹھ جاتے تھے۔ظاہر ہے اتنی کوشش کے بعد جو شعر ہوں گے وہ آخری گھڑے کے پانی جیسے ہی ہوں گے۔

تبھی تو نصرتؔ صاحب نے ان کے فن اور شخصیت پر مضمون لکھا وہ اپنی نوعیت کا پہلا مضمون ہے۔ فیضؔ صاحب کی شاعری کو ادبی دنیا سے روشناس کرانے میں نصرتؔ صاحب کا بڑا ہاتھ ہے۔ فیضؔ صاحب کے ان اشعار سے آپ ان کی شعری صلاحیت کا اندازہ لگائیں اور نصرتؔ صاحب کی ناقدانہ نظر کی داد دیں۔

جب بلندی پر پہونچ جاتے ہیں لوگ
کس قدر چھوٹے نظر آتے ہیں لوگ
گھنا گھنا تو ہے جنگل حیات کا لیکن
شجر شجر تنہا کھائی دیتا ہے

یہ اور اس طرح کے دوسرے کئی اشعار کا انتخاب کر کے انہوں نے اپنے استاد کو ادبی دنیا میں ایک مقام دلوایا۔ فیضؔ صاحب کی موت ۴۸ سال کی عمر میں ہوگئی۔ ان کی موت کے بعد ایک اور شعری مجموعہ شائع ہوا۔ نصرتؔ صاحب چند برسوں تک اپنی تعلیمی قابلیت سے شہر بھیونڈی میں اکاؤنٹینٹ کی حیثیت سے پرائویٹ نوکری کی۔ ۱۹۷۹ء میں ان کا تقرر بینک میں ہوگیا اور ۳۲ سال سروس کرنے کے بعد بامبے مرکنٹائل ۲۰۱۲ء میں سبکدوش ہوئے تھے۔ بینک ملازمت کے دوران انہوں نے اپنا رشتہ اردو سے جوڑے رکھا۔ ۱۹۹۵ء میں ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ ''شعوری رجحانات'' شائع ہوا۔ اس کا اجراء شہر کی مشہور انجمن فروغ تعلیم نے کیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ شہر بھیونڈی کا یہ پہلا تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان کا تنقیدی نظریہ یہ ہے کہ روایت کی پاسداری اور اس جدیدیت کی مخالفت کی جائے۔ نصرتؔ صاحب کا کہنا ہے کہ اردو شاعری کسی بھی عزم کے تحت فروغ نہیں پا سکتی۔ اسے تمام پابندیوں سے آزاد ہونا چاہئے۔ ترقی پسندی بھی کمیونیزم کے زیر اثر رہی۔ اس کا بھی وہی حشر ہوا۔ چند برسوں میں ہی اس کی بساط پلٹ دی گئی۔ ترقی پسندیوں کے حامی نے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ یہ بڑے ذہین شعرا و ادباء تھے۔ ان کی اپنی ایک سوچ اور فکر تھی۔ اس پر جبر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پھر بھی نصرتؔ صاحب نے کسی بھی دھارے میں بہہ کر جینا پسند نہیں کیا۔ ان کا فیصلہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ انہیں اگر احمد فراز کا کوئی شعر پسند نہیں آیا تو احمد فراز جیسے شاعر کو نہیں بخشا۔ ان کی تنقید کے جملے بڑے نرالے ہوئے ہیں۔ وہ جب ظفر گورکھپوری کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ظفر کی شاعری ترقی پسندوں کے بطن سے پیدا ہوئی تو بڑا لطف آتا ہے اور یہ سچ بھی ہے۔

نصرتؔ صاحب کے اندر بے باکی بھی ہے۔فیضؔ صاحب کے دوسرے شعری مجموعے کے پیش لفظ میں حضرت اعجاز صدیقی نے اپنی عادت کے مطابق لکھا کہ فیضؔ صاحب کچھ روز اور جیتے تو انہیں وہ مقام مل جاتا۔جس طرح کے اشعار کا انتخاب نصرتؔ صاحب نے پیش کیا ہے اس تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے تنقید کے گھسے پٹے جملوں کا استعمال نہیں کیا ہے۔اب آیئے تحقیق کی طرف آئیں۔ان کے دو تنقیدی مضامین کے مجموعے (۱) آخری گھڑے کا پانی (۲) آب مقطہ شائع ہو چکے ہیں۔نصرتؔ صاحب تنقیدی مضامین لکھنے کے دوران ہی تحقیقی نظریے سے بھی چیزوں کو بھی دیکھا کرتے ہیں۔ابتداء میں انہوں نے ایک مضمون جو کافی طویل ہے ''اردو وادی خار'' میں لکھا تھا۔اس سے ان کی زبان اور تحقیق کا پتہ چلتا ہے۔ڈاکٹر خورشید نعمانی نے اسے اردو کا مقدمہ کہا ہے۔کتابی شکل میں انہوں نے سب سے پہلے ''شعرائے بھیونڈی'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ان سے قبل ملک مومن نے بھی ''آئینہ'' کے نام سے ایک تحقیقی تذکرہ لکھا تھا۔لیکن اس میں اتنا مواد نہیں ہے۔نصرتؔ صاحب نے مضامین کا شکل میں تذکرہ لکھا۔بڑے اور اچھے شاعروں پر کافی مواد دیا تھا۔انہیں تذکرے کا نام پر شاعروں کا بائیوڈاٹا لکھنا پسند نہیں تھا۔ان کی نظر میں یہ بچوں کا کام ہے۔انہوں نے کئی شاعروں کے بارے میں مقالے کا طرز اپنایا ہے۔نصرتؔ صاحب کے دوستوں نے بتایا کہ یہ کتاب انہوں نے ۳۰۲ ہفتے میں تیار کر لی تھی۔نصرتؔ صاحب کافی لکھاڑ ہیں اسی طرح انہوں نے ''تذکرہ شعرائے مہاراشٹر'' جلد اول اور دوم شائع کی۔یہ ۹۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔یہ ایک ادبی دستاویز ہے۔اس کی قدر جیسے جیسے زمانہ بیتتا جائے گا بڑھتی جائے گی۔یہ قابل ذکر بات ہے کہ شعرائے مہاراشٹر دس جلدوں میں شائع ہوگی۔ہر علاقے کا الگ الگ تذکرہ ہوگا۔اس کے شائع ہوتے ہی ''شعرائے بمبئی'' کا تذکرہ لکھا جانے لگا اور بمبئی یونیورسٹی میں مقالہ مکمل بھی ہو گیا ہوگا۔آپ کے لیے ایک خاص بات اور ہے کہ سو سال سے بمبئی کا تذکرہ نہیں لکھا گیا تھا۔اب اس تذکرے سے شاخیں پھوٹنے لگی ہیں۔چراغ سے چراغ جلتا ہے۔اس کتاب کا پیش لفظ اردو کے مشہور نقاد اور محقق اور بمبئی یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر مجاہد حسین حسینی ،معروف شاعر ساز اور ابراہیم اشک نے لکھا ہے۔سب نے اس کتاب کو ایک ادبی دستاویز کہا ہے۔ان کے جملے آپ کی نذر ملاحظہ ہوں۔

''جناب خلیق الزماں نصرتؔ کی بیش بہا اور بے پناہ افادات کی حامل کتاب ادب گاہ

بمبئی بنام شعرائے مہاراشٹر کو جب میں نے سرسری طور پر پڑھا اور چاہا کے اسے بلا تکلف رکھ دوں تو اس ظالم ہاتھوں کی گرفت اور نظروں کی توجہ سے ہٹنے سے یکسر انکار کر دیا۔ علامہ آرزو لکھنوی مرحوم کی زبان میں گویا اس نے مجھ سے احتجاج کیا اور کہا"۔

جاتے کہاں ہیں وآپ نظر مجھ سے موڑ کے
تصویر نکلی پڑتی ہے، آئینہ توڑ کے

(پروفیسر مجاہد حسین حسینی، سابق صدر شعبۂ اردو، بمبئی یونیورسٹی)

''جناب خلیق الزماں نصرتؔ صاحب ادبی تلاش و تحقیق کے ضمن میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ موجودہ تحقیقی کتاب ممبئی اور مضافات کے شعراء کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ تحقیقی، تدفیق، تلاش، سراغ اور عملی جدوجہد کا بڑا کام ہے۔ ایک ادارے بھر کے اس کام کو نصرتؔ صاحب نے تن تنہا انجام دیا ہے''۔

(عبدالاحد ساز، ممبئی)

''ممبئی کی شاعری کے تعلق سے یہ ایک ایسی دستاویز ہے جو آئندہ نسلوں کے لیے بے حد کارآمد ثابت ہوگی۔ نصرتؔ کی یہ تحقیق اس صدی کا بے بدل اور بے تحفہ ہے جو مستقبل کے محققین کے لیے بھی مشعل راہ بنے گا''۔

(ابراہیم اشک، ممبئی)

نصرتؔ صاحب کی زبان و بیان سے متعلق ڈاکٹر یحییٰ نشیط رقم اللسان ہیں:

''نصرتؔ کا قلم رواں دواں ہے، زبان سہل و آسان اور تراکیب سے یکسر آزاد ہے۔ وہ عالمانہ بیان سے اپنی زبان کو بوجھل اور غیر موثر نہیں بناتے۔ ان کا طرز فہمائش بھی گنجلک اور پیچیدہ نہیں۔ ان کا نثری اسلوب جاذب قلب ہے۔ جس زبان میں وہ گفتگو کرتے ہیں اس زبان کو تحریر کے لیے استعمال کرتے ہیں، اس لیے بے ساختگی اور برجستگی اس میں پائی جاتی ہے''۔

تحقیق کا ایک نایاب نمونہ خلیق الزماں نصرتؔ کی مایہ ناز کتاب ''برمحل اشعار اور ان کے مآخذ'' ہے۔ اس کا ذکر ہندوستان ہی نہیں بیرون ہندوستان میں ہو رہا ہے۔ عرصے تک نصرتؔ صاحب کو لوگ یہ

شعر کس کا ہے جاننے کے لیے فون کرتے تھے اور ان سے رابطہ کرتے تھے اور نصرتؔ صاحب کسی شعر کے خالق کا نام بتایا کرتے تھے۔ تقریباً چار سال تک ان کے اشعار برمحل انقلاب میں شائع ہوتے رہے۔ اس سے کافی لوگوں نے استفادہ کیا۔ شاعر میں کئی مضمون برمحل اشعار پر مستقل شائع ہوتے رہے۔ اب تک اس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اب تک جن حضرات نے ان کی کتاب کی ستائش کی ہے اور اپنی تحریر سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے ان میں شمس الرحمٰن فاروقی، ندا فاضلی، پروفیسر مجاہد حسین حسینی، اسلم مرزا، حقانی القاسمی، ظفر ہاشمی، رفیع انصاری، ایم مبین، مولانا ابوظفر حسان ندوی، محمد صدیقی، مشتاق شمس، مشتاق قاضی، ڈاکٹر یحیٰ نشیط، ڈاکٹر وہاب اشرفی، ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی وغیرہ خاص ناقد اور مضمون نگار ہیں۔

نصرتؔ صاحب نے یہیں پر اپنا کام ختم نہیں کیا برمحل اشعار کی دوسری جلد بھی انہوں نے تیار کر رکھی ہے اس کے شائع ہونے کے بعد ان کے پاس کئی اشعار ہیں جنھیں وہ آئندہ شائع کرنے میں لگے ہوتے ہیں اب میں ان کی تحقیقی کام کا نمونہ آپ کے سامنے پیش کروں گا اس سے آپ چونک جائیں گے کہ فلاں شعر تو فلاں کا تھا۔ نصرتؔ صاحب کے مطابق تو یہ شعر کسی اور کا ہے۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار
جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں

بہادر شاہ ظفرؔ — مضطرؔ خیرآبادی

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

رام پرساد بسملؔ — بسملؔ عظیم آبادی

عمر دراز مانگ کے لائی تھی چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

بہادر شاہ ظفرؔ — سیمابؔ اکبرآبادی

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

علامہ اقبالؔ — شہر مچھلی شہری

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

میرؔ فکرؔ یزدانی

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتاہے جو منظور خدا ہوتا ہے

اقبالؔ محمد رضا برقؔ

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کے ہیں کل کی خبر نہیں

اقبالؔ حیرتؔ الہ آبادی

خدانے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہوجس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

اقبالؔ مولانا ظفرؔ علی خان

ایک پتھر کی بھی تقدیر سنور سکتی ہے
شرط یہ ہے کہ سلیقے سے تراشا جائے

اقبالؔ منظور ندیم بالا پوری

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن
مقابلہ تو دل نا تواں نے خوب کیا

میرؔ امیرؔ

اس طرح کے کئی اشعار جن کو لوگ ان کے خالق کے نام غلط جانتے ہیں ان کے صحیح شاعر کا نام نصرتؔ صاحب نے ثبوت کے ساتھ پیش کیا ہے اور زیادہ تر اشعار کے لیے انہوں نے دیوان یا شعری مجموعے کا حوالہ دیا ہے۔ دیوان کھو جنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ نصرتؔ صاحب کتاب برمحل اشعار سے استفادہ کر کے مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ ان کے اشعار کا سرقہ کر کے لوگ بیت بازی کی کتاب ترتیب دے رہے ہیں۔ لیکن اس کا کریڈیٹ تو صرف نصرتؔ صاحب کو ملنا

چاہیے۔بغیر کسی حوالے سے اتنی تعداد میں اشعار لے لینا ادبی دیانت داری نہیں ہے۔

نصرتؔ صاحب نے تقریباً پندرہ سو اشعار کو برمحل چن کر ان کو نامعلوم ہونے سے بچالیا ہے۔اور لگ بھگ دو ہزار اشعار اور جو دوسری جلد اور مشہور اشعار گم نام شاعر جلد اول اور دوم غیر مطبوعہ میں شامل ہے یہ اپنے آپ میں ایک ریکارڈ ہے۔نصرتؔ صاحب نے شمار گمنام شاعروں کو قارئین سے روشناس کرایا ہے۔نصرتؔ صاحب کے مضامین ہندوستان کے بڑے بڑ رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ان رسالوں میں آج کل ،اردو دنیا ،فکر وتحقیق، دربھنگہ ٹائمز، بے باک اور بچوں کی دنیا وغیرہ۔ان کے مضامین میں نئے عنوانات کی جھلک رہتی ہے ہر بار ایک نئی کھوج جو اردو ادب کے محققین کے لیے مشعلِ راہ ہوتے ہیں۔بہت سارے ایسے عنوانات پر لکھے گئے ہیں کہ ان موضوع پر کسی نے قلم فرسائی نہیں کی ہے۔چند عنوانات دیکھتے چلیں۔برمحل اشعار میں کسی استاد زباں کی اصلاح یا تصرف فلموں میں برمحل اشعار کا استعمال، ہندو شعراء کے برمحل اشعار، پروین شاکر کی غزلوں میں مردوں کی بے وفائی اور فرہنگ آصفیہ میں انتساب شعر کی غلطیاں اور نامعلوم اشعار کے خالق کا نام وغیرہ خاص ہیں۔

نصرتؔ صاحب صرف عنوانات پر مضامین ہی نہیں لکھتے ان کی کتابیں بھی نئے موضوعات پر رہتی ہیں۔فی الحال جو کتابیں ان غیر مطبوعہ ہیں ان میں زیر، زبر، پیش، استعارہ، سرقہ اور نوارد، شعرائے اشرط تیسری جلد (مالیگاؤں) بہت اہم ہیں اتنا ہی نہیں نصرتؔ صاحب مقامی اور بیرونی شاعروں اور ادبی جلسوں میں اپنی غزلیں اور مقالے پڑھتے رہے ہیں۔اس لیے لوگ ہر جگہ انہیں چہرے سے نہیں تو کم از کم نام سے ہی جانتے ہیں۔اس کے علاوہ یہ ان کی خوش نصیبی ہے کہ ان کی کتابوں سے مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی، بہار اردو اکادمی اور یوپی اردو اکادمی سے کئی بار انعامات و اعزازات مل چکے ہیں۔مگر ان کی ادبی خدمات کے عوض میں تحسین اور ستائش بہت کم ہیں۔وہ آدمی جس نے اردو کو روزی نہیں بنایا پھر بھی تقریباً پچاس سال سے اس طرح بے لوث خدمت کیے جارہا ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد کاشف

Assistant Professor, Department of Urdu, University of Hyderabad, Telangana

'ایوان غزل' کے نسائی کردار: ایک تانیثی مطالعہ

ملخص:

تانیثیت ایک ایسا طرز فکر، رجحان یا تحریک ہے جس کا اصل مقصد خواتین پر ظلم و زیادتی کے خلاف آواز اٹھانا یا ان کے حقوق کے حصول کے لیے جدو جہد کرنا ہے۔ تانیثی فکر کا آغاز وارتقا مغربی ممالک میں ہوا۔ مغربی ملکوں میں ہی یہ تحریک کی شکل اختیار کرتی ہے۔ بیسویں صدی میں اس تحریک میں مزید شدت پیدا ہوئی۔ مغربی ممالک کے ساتھ مشرقی ممالک میں بھی یہ تحریک سرگرم ہوئی۔ ہندستان میں تانیثی تحریک کی ابتدا مرد سماجی مصلحین کے ہاتھوں ہوئی۔ ان سماجی مصلحین نے اصلاح معاشرہ کے ساتھ ساتھ خواتین کے مسائل پر بھرپور توجہ دی اور ان کے حقوق کے لیے ہر سطح پر آواز بلند کی۔ جس کے نتیجے میں خواتین بھی شعوری طور پر بیدار ہوئیں۔

جیلانی بانوں نے ناول ''ایوان غزل'' میں آزادی سے قبل اور بعد حیدرآباد کی سیاسی وسماجی تبدیلیوں اور بدلتی ہوئی تہذیب وثقافت کو موضوع بنایا ہے۔ ناول کو پڑھ کے اس زمانے کی عورتوں کی سماجی حیثیت سے ہم نہ صرف واقف ہوتے ہیں بلکہ اس عہد کے مسائل کے محرکات پر غور وفکر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ تانیثی اعتبار سے اگر اس ناول کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ اس ناول کے زیادہ تر کردار بشمول مرکزی کردار احتجاجی رویہ اختیار نہیں کرتے ہیں۔ نا ہی مصنفہ کا مقصد اس ناول میں احتجاجی یا باغیانہ رویے کی عکاسی کرنا ہے۔ ایوان کے سارے کردار اپنی جگہ پر اہم اور کہانی کو آگے بڑھانے میں معاون ہیں۔ مگر جیلانی بانو نے نسوانی کردار کے پیش کش میں کافی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔ عورت ہونے کے ناطے وہ نسوانی کرداروں کے مسائل ان کے جذبات واحساسات اور نفسیات سے واقف ہیں۔ مصنفہ نے ہر طبقے کی عورتوں کے سماجی مسائل اور ان کی نفسیاتی حالات کی عکاسی میں کمال ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔ جاگیردارانہ سماج میں عورت کی حیثیت اور اس نظام کے تحت اس کے استحصال کے مختلف شکلوں کو جس طرح سے مصنفہ نے پیش کیا ہے یہ انھیں کا کمال ہے۔

کلیدی الفاظ:۔ تانیثیت، حقوق نسواں، جاگیردارانہ نظام، استحصالی نظام، سماجی مسائل

تانیثی تحریک یا تانیثیت ایک ایسا طرز فکر، رجحان یا تحریک ہے جس کا اصل مقصد خواتین پر ظلم و زیادتی کے خلاف آواز اٹھانا یا ان کے حقوق کے حصول کے لیے جدو جہد کرنا ہے۔ تانیثی تحریکات دراصل سماج میں صنفی مساوات کے لیے شروع کی گئی۔ اس میں خواتین کی محکومیت کے خاتمے ان کی شخصی آزادی، ان کے حقوق کے حصول اور ان کو باختیار بنانے پر زور دیا گیا۔ علاوہ ازیں اس کے مقاصد میں خواتین پر ہونے والے ظلم کے خلاف سماج کو بیدار کرنا اور خود خواتین کو بھی اپنے حقوق کے حصول کے لیے متحرک کرنا شامل رہا ہے۔

تانیثی فکر آغاز وارتقا مغربی ممالک میں ہوا۔ مغربی ملکوں میں ہی یہ تحریک کی شکل اختیار کرتی ہے۔ بیسویں صدی میں تانیثیت کی تحریک میں مزید شدت پیدا ہوئی۔ مغربی ممالک کے ساتھ مشرقی ممالک میں بھی یہ تحریک سرگرم ہوئی اور تانیثیت کی تحریک میں مختلف نقاط نظر بنتے چلے گئے۔ مشرقی تانیثیت کی بنیادی نظریات مغربی تانیثیت سے بالکل جدار ہے ہیں۔ ہندستان میں آزادیٔ نسواں اور حقوق نسواں کے نام پر عورت کے لیے بیادی حقوق کے حصول کی کوششیں ہوتی رہیں۔ شادی اور خاندان کے اداروں میں خواتین کے مقام و مرتبے کو بہتر بنانے اور ان کے تمام حقوق اور سماج میں باعزت مقام کے حصول کی سعی ہندستان میں تانیثی فکر کی اولین ترجیحات رہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ہندستان میں تانیثی تحریک کی ابتدا مرد سماجی مصلحین کے ہاتھوں ہوئی۔ ہندستان میں نشاۃ ثانیہ کے آغاز کے ساتھ ہی سماجی مصلحین نے اصلاح معاشرے کے ساتھ ساتھ خواتین کے مسائل پر بھرپور توجہ دی۔ خواتین کی تعلیم اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے مختلف سطحوں پر کوششوں کا آغاز ہوا جس کے نتیجے میں خواتین بھی شعوری طور پر بیدار ہونے لگیں۔ آزادی کے بعد قانون سازی نے خواتین کو اعلیٰ تعلیم و ترقی کے حصول کی طرف متوجہ کیا۔ انھیں مردوں کے مساوی موقف حاصل کرنے میں مدد ملی۔ ان تبدیلیوں کے خاندانی نظام اور سماج میں خواتین کی حیثیت کے مختلف پہلوؤں پر کسی حد تک اثر ضرور مرتب کیا۔

جیلانی بانوں کا پہلا ناول ''ایوان غزل'' ہے۔ اس ناول میں انھوں نے آزادی سے قبل اور مابعد آزادی حیدرآباد کی سیاسی وسماجی تبدیلیوں کو اور بدلتی ہوئی تہذیب وثقافت کو موضوع بنایا ہے۔ آزادی سے قبل اور اس کے بعد تک بھی ہندستان میں جاگیردارانہ نظام قائم رہا۔ اس نظام

میں عورتوں کی حالت بہت خراب تھی۔اس طرح کے سماج میں ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ان کا کام صرف گھر کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ نچلے طبقے کی عورتیں کھیتوں میں محنت کرتیں اور جاگیرداروں اور تحصیلداروں کے ہوس کا شکار بھی ہوتی تھیں۔اس دور میں عورتوں کو محض جنسی تسکین کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ان کے جذبات واحساسات کی نہ تو جاگیرداروں کو پرواہ تھی نہ ہی گھر والوں کو یہاں تک کہ استحصال کا شکار ہونے والی عورتیں بھی یہ ساری ستم برداشت کر لیتی تھیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ غریب طبقہ جاگیرداروں کے ظلم وستم اور معاشی استحصال سے اس قدر ٹوٹ چکا تھا کہ ان کے دلوں میں باغیانہ خیال تک نہیں آتے تھے۔اس تمام صورت حال کو مصنفہ نے اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے۔اس ناول کو پڑھ کے اس زمانے کی عورتوں کی سماجی حیثیت سے ہم نہ صرف واقف ہوتے ہیں بلکہ اس عہد کے حالات ومسائل کے محرکات پر غور وفکر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔تانیثی اعتبار سے اگر اس ناول کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح طور سامنے آتی ہے اس ناول کے زیادہ تر کردار بشمول مرکزی کردار کے احتجاجی رویہ اختیار نہیں کرتے ہیں۔ناہی مصنفہ کا مقصد اس ناول میں احتجاجی یا باغیانہ رویے کی عکاسی کرنا ہے۔وہ اس زمانے کی صورتحال کو اس طرح سے اجاگر کر دیتی ہیں جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان برائیوں کی اصل وجہ زوال پذیر جاگیردارانہ نظام ہے۔ یہاں اس ناول کے نسائی کرداروں کا تانیثی اعتبار سے جائزہ مقصود ہے۔ناول میں دو یا تین کردار ایسے ہیں جن میں باغیانہ روح موجود ہے۔

ایوان کے سارے کردار اپنی جگہ پر اہم اور کہانی کو آگے بڑھانے میں معاون ہیں۔چھوٹے کردار بھی ناول کے پلاٹ کا حصہ ہیں۔مگر جیلانی بانو نے نسوانی کردار کے پیش کش میں کافی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔عورت ہونے کے ناطے وہ نسوانی کرداروں کے مسائل ان کے جذبات واحساسات اور نفسیات سے اسی طرح واقف ہیں۔مصنفہ نے ہر طبقے کی عورتوں کے سماجی مسائل اور ان کی نفسیاتی حالات کی عکاسی میں کمال ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔جاگیردارانہ سماج میں عورت کی حیثیت اور اس نظام کے تحت اس کے استحصال کے مختلف شکلوں کو جس طرح سے مصنفہ نے ابھارا ہے یہ انھیں کا کمال ہے۔

بی بی اور لنگڑی پھوپھو جہاں دنیاوی مسائل سے بے نیاز ہیں وہیں چاند اور غزل استحصال نظام کا شکار ہیں تو دوسری طرف قیصر اور کرانتی اس استحصالی نظام کے خلاف بغاوت کی ترجمانی کرتی ہیں۔

چاند اور غزل ناول کے مرکزی کردار ہیں۔ ان کے ذریعہ سماج کے بدلتے ہوئے صورت حال کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

چانداس ناول کا اہم کردار ہے۔ وہ بشیر بیگم اور حیدر علی خان کی اکلوتی بیٹی ہے۔ وہ حسن میں بے مثال ہے۔ اس کی شوخی حسن کو دوبالا کر دیتی ہے چاند جدید تعلیم سے بہرور ہے کیوں کہ اس کے والد ترقی پسند خیالات کے حامی ہیں وہ اپنی بیٹی کو ڈاکٹر بنانا چاہتے ہیں۔ چاند کانوینٹ اسکول سے تعلیم حاصل کرتی ہے ڈراموں میں حصہ لیتی ہے۔ فلم کی شوقین ہے اس ماحول نے کم عمر میں ہی چاند کو اپنے حسن و جمال کا احساس کر دیا۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو غیر معمولی لڑکی سمجھتی ہے چودہ برس کی عمر میں ہی پڑوس کے لڑکے سے محبت کر لیتی ہے۔ لیکن پہلی محبت میں ہی اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

چاند ایک آزاد خیال اور فیشن پرست لڑکی لیکن اس کی آزادہ روی واحد حسین کو پسند نہیں۔ والد اور نانا واحد حسین اس کی آزادہ روی پر روک لگانا چاہتے ہیں مگر اس کے برعکس اس کے ماموں راشد اس کی حمایت کرتے ہیں۔ ماموں بزنس کے اصول سے واقف تھے وہ خوب جانتے تھے کہ چاند جیسی خوبصورت اور تہذیب یافتہ لڑکیوں کے توسط سے کسی بھی مقصد کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

ماں کی موت اور باپ حیدر علی خان کی دوسری شادی کے بعد چاند سولہ برس کی عمر میں اپنے نانیہال ''ایوان غزل'' میں آجاتی ہے۔ یہاں راشد جو اس کا ماموں ہے اس کے توسط سے دولت حاصل کر کے ایوان غزل کے گرتے ہوئے در و بام کا سنبھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں چاند کو ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرتی ہے اور کلب بھی جاتی ہے۔ ڈراموں میں حصہ لیتی ہے۔ بھارت کلا مندر کے سکریٹری بھان صاحب کے اس کے گرد منڈلانے پر راشد کو اعتراض نہیں ہوتا کیوں کہ چاند کی وجہ سے ایوان غزل میں پھر سے دولت آنے لگتی ہے۔

چاند کی زندگی میں نیا موڑ تب آتا ہے جن سنجیوا سے عشق کر بیٹھی ہے۔ سنجیوا ایک معمولی آرٹسٹ ہے جواب ایک کمیونسٹ ورکر بن گیا ہے۔ سنجیوا سے چاند کی ملاقات اس وقت ہوتی ہے جب سنجیوا چاند کے والد کا خط لے کر آتا ہے۔ چوں کہ چاند کے والد سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے روپوش ہیں۔ سنجیوا چاند کے عشق کو قبول نہیں کرتا ہے کیوں کہ سیاسی مقاصد اس کے لیے زیادہ عظیم ہیں اور یہ عشق اس میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔ سنجیوا کی بے رحمی کو چاند برداشت نہیں کر پاتی ہے۔ دھیرے دھیرے موت کے آغوش میں چلی جاتی ہے۔

''غزل'' اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ وہ ہمایوں علی شاہ اور بتول بیگم کی بیٹی اور چاند کی خالہ زاد بہن ہے۔ غزل کی زندگی کے تمام اہم واقعات کو اس ناول میں پیش کیا گیا ہے۔ غزل بھی چاند کی طرح حسین ہے۔ اس کا بچپن ایک حبس زدہ ماحول میں گزرتا ہے جہاں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس کی ماں بتول بیگم ہمایوں کے عتاب کا شکار رہتی ہے۔ غزل باپ کی محبت سے محروم رہتی ہے۔ اپنے نانیہال میں بھی وہ نفرت کا شکار رہتی ہے۔

ماں کی بے وقت موت سوتیلی ماں کا عتاب باپ کی بے حسی اور نفرت نے جذباتی اور ذہنی طور پر اسے بکھیر کے رکھ دیتا ہے۔ ان واقعات نے اس کی ذہنی و جذباتی نشو ونما میں اہم رول ادا کیا ہے۔ وہ بچپن سے محبت و شفقت کی بھوکی رہتی ہے۔ جہاں یہ ملے وہاں اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار رہتی ہے۔ چاند کی ذرا سی ہمدردی غزل کو اس کا گرویدہ بنا دیتی ہے۔ چاند کی مدد سے وہ تھیٹر اور اسٹیج کے آداب و اطوار سے روشناس ہوتی ہے۔ دھیرے دھیرے اپنی اداکاری کا جلوے دکھانے شروع کر دیتی ہے۔ یہاں سے غزل کی زندگی میں المناک حادثے رونما ہونے لگتے ہیں۔ غزل بھی چاند کے طرز پر چلنا شروع کر دیتی ہے۔ آخر کار اس کا انجام بھی دردناک ہوتا ہے۔

چاند ایک بار اسے مشورہ دیتی ہے۔

> ''غزل تو بھی خود چلنا چھوڑ دے اپنی تقدیر بنانے کا حوصلہ ہر عورت میں نہیں ہوتا اس لیے اپنی باگیں بی بی کے ہاتھ میں تھما دے ورنہ راشد ماموں اور خالو پاشا تجھ سے اپنی کامیابیوں کے قفل کھولیں گے اور تجھے پھینک دیں گے۔''

بھان صاحب کی وجہ سے وہ بھارت کلا مندر کی ممبر بن گئی۔ انھوں نے غزل کے حسن و جمال کا فائدہ اٹھایا وہیں اس کی ملاقات بلگرامی سے ہوتی ہے۔ جس نے اپنی چھوٹی محبت کے جھال میں پھانس کر غزل کو ہوس پرستی کا نشانہ بنایا۔ بقول ناول نگار وہ محبت کی تلاش میں جانے کتنے خطروں میں کود گئی۔

بلگرامی کی بے وفائی کا غزل پر شدید اثر پڑتا ہے اس کے علاوہ نصیر بھی اس کی زندگی میں آتا ہے۔ اس کے اظہار عشق پر اتنا تن من دھن سب کچھ نصیر کو سونپ دیتی ہے۔ وہ بھی اسے اپنی ہوس کا شکار بناتا ہے۔ ایک انگوٹھی نشانی کے طور پر اسے دے جاتا ہے۔ انگوٹھی کو وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ زندگی میں مختلف ٹھوکر کھانے کے باوجود وہ ہر بار غلط راہ اختیار کرتی ہے۔ آخر میں اس کا ماموں زاد بھائی

شاہین غزل کے ماضی سے واقف ہونے کے باوجود اس سے شادی کر لیتا ہے۔ شاہین سے شادی کے بعد اس کو سکون میسر نہیں ہوتا۔ کیوں کہ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ناپاک اور ذلیل سمجھتی ہے۔ نصیر دوبارہ اس کی زندگی میں آتا ہے۔ سوئے ہوئے محبت کے جذبات پھر سے جاگ اٹھتے ہیں لیکن وہ غزل سے دی ہوئی انگوٹھی واپس لے لیتا ہے۔ یہی غزل کے موت کا سبب بن جاتی ہے۔ دراصل ناول میں غزل کو بہت ہی جذباتی اور معصوم لڑکی دکھایا گیا ہے۔ اس وجہ سے وہ ذہنی اور جذباتی الجھن کا ہمیشہ شکار رہتی ہے۔

''قیصر'' یہ کردار ناول میں تھوڑے وقفے کے لیے آیا ہے۔ قیصر واحد حسین کے باپ کی ناجائز اولاد فاطمہ بیگم کی بیٹی ہے۔ اس کا باپ احمد حسین کے یہاں بندھوا مزدور ہے۔ وہ چاند کی ہم عمر ہے۔ اس کی پرورش بھی ایوان غزل میں ہوتی ہے۔ یہاں وہ ظلم وستم اور نفرت کا شکار ہوتی ہے۔ لیکن اس کی خاص بات یہ ہے کہ وہ استحصال معاشرے کے خلاف مزاحمت کرتی ہے۔ اس کے خلاف آواز بلند کرتی ہے۔ وہ تلنگانہ تحریک میں شامل ہو کر جاگیردارانہ ظلم واستحصال کے خلاف مسلح بغاوت میں حصہ لیتی ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ کہ استحصالی معاشرے کا خاتمہ ہو جائے۔ بغاوت کے الزام میں اسے پھانسی کی سزا ہوتی ہے۔ وہ غزل کو ایک جگہ مشورہ دیتی ہے۔

''چاند کی طرح مردوں سے کھلنا چھوڑ دو جسم کے علاوہ دماغ بھی تو ہے
تمہارے پاس وہ کیوں نہیں بیچتیں۔''

قیصر کا کردار ایک متحرک اور فعال کردار ہے۔ وہ جاگیردارانہ سماج کے خلاف مسلح بغاوت کرتی ہے اور یہی مزاحمت اسے تانیثی اعتبار سے اہمیت کا حامل بناتی ہے۔ بدلتے ہوئے حالات میں جو قوتیں ابھر رہی ہیں وہ ان کی ترجمانی ہے۔

''کرانتی'' قیصر سنجیوا سے شادی کر لیتی ہے۔ اس کے یہاں ایک بچی پیدا ہوتی ہے جس کا نام کرانتی ہے۔ وہ اپنے والدین کی طرح انقلابی عزائم رکھتی ہے۔ نامساعد حالات کا ہمت وحوصلہ کے ساتھ وہ مقابلہ کرتی ہے۔ کرانتی بھلے ہی تھوڑی دیر کے لیے ناول میں آئی ہے اتنے ہی وقفے میں اپنا نقش چھوڑ جاتی ہے۔ وہ غزل اور چاند کے برخلاف اپنا حق خود حاصل کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ اپنی ماں کی طرح استحصالی نظام کے خلاف مسلح بغاوت میں حصہ لیتی ہے۔ اپنی طرف بڑھتے ہوئے ہوس پرست ہاتھوں کو موڑ دیتی ہے کیوں کہ نصیر نے ایک مرتبہ موقع پا کر کرانتی کی طرف پیش قدمی کی

کوشش کرتا ہے لیکن اس کے جواب سے اس کی حوصلہ پسندی اور مزاحمتی رویے کی نشاد ہی ہوتی ہے۔ دراصل کرانتی ہی کا کردار تانیثی اصولوں پر پورا اترتا ہے۔ کرانتی ایسی لڑکی ہے جو ہوس اور جذبات میں نہیں بہتی اور نہ ہی اس کے عزائم اسے حالات کا شکار ہونے دیتے ہیں۔ وہ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے واقف ہے۔ دوسری طرف وہ نئی نسل اور نئی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے کردار ایوان غزل میں کم ہیں اور مختصر وقفے کے لیے آتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ نسائی کردار آج کل کے قاری پر اچھا نقش ثبت کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا نسائی کرداروں کے علاوہ اس ناول میں اور بھی کئی نسائی ضمنی کردار ہیں جو اپنے عہد کی زندگی اور اس کے مختلف و متضاد پہلوؤں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان میں رضیہ، اجالا بیگم، لنگڑی پھوپھو، بی بی۔ گو کہ ان تمام نسائی کردار کی حیثیت اس عہد کی جاگیردارانہ معاشرے میں ایک جنسی تفریح کے سامان سے زیادہ نہ تھی۔ کچھ نسائی کردار جیسے قیصر اور کرانتی نے اس استحصالی نظام کے خلاف اپنے غم و غصے کا اظہار برملا طور پر کیا ہے، کچھ نسائی کردار ایسے بھی ہیں جو خاموشی اور بے زبانی کے ساتھ اس استحصالی نظام کا حصہ بننے سے انکار کرتے ہیں۔

بی بی بہت بھولی اور معصوم تھیں۔ دنیا سے بے خبر اپنا حق مانگنے سے بے پرواہ۔ ان کے حوالے سے مصنفہ خود لکھتی ہیں۔

> ''یہ وہ عورت تھی جس نے پچیس برس کی عمر میں پچیس عشق کرنے والے واحد حسین کو اپنے پاس بیٹھایا تو پھر وہ کس کی طرف نہ دیکھ سکے مگر اس ڈیوڑھی میں لاکر تین بچوں کی ماں بنا کر بھی بی بی ان کے ہاتھوں میں نہیں آئی تھیں۔''

واحد حسین بی بی سے شادی کر کے بھی ان کا دل نہ جیت سکے کیوں کہ بی بی کو زبردستی واحد حسین کے نکاح میں لایا گیا۔ ایوان غزل میں اپنے آپ کو ملکہ سمجھنے کے بجائے ایک چپراسی کی لڑکی سمجھتی تھیں۔ انھوں نے گھر کے سارے اختیارات لنگڑی پھوپھو کو سونپ دیے اور خود گھر کے معاملات سے الگ تھلگ رہتی ہیں۔ ان کا یہ رویہ بھی دراصل استحصالی نظام کے خلاف احتجاج کی ایک شکل ہے۔

لنگڑی پھوپھو جن کو وراثت میں بے دخل کرنے کے لیے معذور کر دیا جاتا ہے۔ ظلم و ستم کے خلاف وہ بھی جذبہ بغاوت محسوس کرتی ہیں۔ ایک موقع پر وہ راشد سے کہتی ہیں۔

''ارے میں تم لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہوں۔تم سب ایک تھیلے کے چٹے بٹے
ہو۔کبھی مجھے نیچے پھینک دیتے ہو کبھی چاند کو آگ میں جھونک دیتے ہو۔۔۔اس
ایوان غزل میں مٹی ڈالوں جہاں عورت کو لوٹ کھسوٹ کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔''

اس اقتباس سے عورتوں کے تئیں ایوان غزل میں جو رویہ اپنایا جاتا ہے اس کے خلاف لنگڑی پھو پھو کے غم وغصہ کا اظہار ہوتا ہے۔لنگڑی پھو پھو بھی عمر کے آخر میں معاشرے سے بغاوت شیخو بھائی سے عقد کر کے کرتی ہیں۔یہ دراصل جبر اور جنسی استحصال کے خلاف ان کا احتجاجی رویہ ہے جو اس نظام کے خلاف ان کی بیزارگی اور غم وغصے کا غماز ہے۔

ایوان غزل کے دو مرکزی نسوانی کردار چاند اور غزل ہیں۔ان کی پرورش ایوان غزل میں مختلف حالات میں ہوتی ہے۔لیکن دونوں میں مماثلت اس اعتبار سے ہے دونوں جاگیردارانہ استحصالی نظام کا شکار ہوتی ہیں۔دونوں کا انجام بھی دردناک ہوتا ہے۔یہ صحیح ہے کہ غزل کی مخصوص حالات میں پرورش کی وجہ سے اس کی نفسیات میں کچھ کمزوریاں پیدا ہوگئی ہیں۔لیکن حیرت ہوتی جب غزل دھوکہ کھا کر بار بار غلطیاں کرتی ہے۔حالات کا شکار ہو کر بھی اپنے تجربے سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتی۔ایسا بھی نہیں کہ وہ بالکل نری جاہل لڑکی ہو چاند کی طرح وہ بھی جدید تعلیم سے بہرور ہے۔ڈرامے میں کام کر کے اپنی فنی صلاحیت کو اجاگر کرتی ہے۔لیکن عشق ومحبت کے معاملے میں اس کا ذہن ودماغ کام نہیں کرتا۔وہ بار بار عشق میں بے وفائی اور مردوں کے ہوس کا شکار ہوتی ہے۔

یہی بات چاند کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔اس کی تعلیم وتربیت مغربی تہذیب کے زیر اثر ہوتی ہے۔لیکن عشق ومحبت کے معاملے میں اس کا جذباتیت کا شکار ہونا حیرت میں ڈالتا ہے۔جدید تہذیب کے پروردہ ہونے کے باوجود چاند اور غزل کا اس طرح سے انفعالی کیفیات کا شکار اور دردناک انجام کو پہنچنا مجھے غیر فطری سا لگتا ہے۔نیلم فرزانہ نے اپنی کتاب اہم خواتین ناول نگار میں جیلانی کے ناول ایوان غزل کا جائزہ لیتے ہوئے غزل کا موازنہ عصمت چغتائی کے کردار شمن سے کیا اور صحیح لکھا ہے کہ دونوں میں مماثلت کے باوجود فرق ہے۔غزل کی فطرت میں بغاوت نہیں۔اس کو اپنے آپ پر اعتماد نہیں۔حالات سے نبرآزما ہونے کی کوشش نہیں کرتی۔بقول عصمت چغتائی غزل حد سے بے قوف لڑکی ہے۔اس کے برعکس شمن میں بغاوت اور احتجاج کی چنگاری موجود ہے۔میرے

خیال میں شمن کی باغیانہ رویے کی جھلک ایوان غزل کے دو ضمنی کردار قیصر اور کرانتی میں پائی جاتی ہے۔ اور یہی دو کردار تانیثی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔

☆☆☆

حواشی:

ایوان غزل، جیلانی بانو

جیلانی کی ناول نگاری کا تنقیدی مطالعہ، مشرف علی

حیدرآباد میں اردو کا نسائی ادب، آمنہ تحسین

اردو ناول آزادی کے بعد، اسلم آزاد

اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار، نیلم فرزانہ

ڈاکٹر نشاں زیدی

B-63/S-2, DLF Colony, Ghaziabad, UP

قرۃ العین حیدر کی سفر نامہ نگاری: ایک جائزہ

تلخیص

قرۃ العین حیدر کا نام اردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں وہ ادب کا ایک ایسا نام ہیں جن پر اردو ادب ہمیشہ فخر کرتا رہے گا۔ کیونکہ قرۃ العین حیدر جیسی شخصیات صدیوں میں جنم لیتی ہیں۔ اردو فکشن کو ایک نئے آہنگ سے اس طرح ہمکنار کیا کہ اردو ادب کو عالمی ادب کے مقابل بنا دیا۔ ان کی تخلیقات قاری کے ذہن میں ایک نئی جہات کے دریچے وا کرتی ہیں۔ افسانے، ناولٹ، ناول، سفر نامے، رپورتاژ، تراجم اور خودنوشت ایک ساتھ کئی اصناف میں طبع آزمائی کر کے انہوں نے اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ قرۃ العین حیدر نے ایک منفرد فکشن نگار کی حیثیت سے ایسا مقام حاصل کیا ہے کہ رہتی دنیا تک قائم و دائم رہے گا۔ ان کے کارناموں کی داستان کا ایک ورق ان کی سفر نامہ نگاری بھی ہے۔ قرۃ العین حیدر کے دو سفر نامے ''دکھلایئے لے جا کر اسے مصر کا بازار'' (1976) اور ''جہان دیگر'' (1979) ان کے بہترین سفر نامے ہیں۔ دیگر نثری تخلیقات کی طرح سفر ناموں کی بھی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ ان میں سفر کے مشاہدات و تجربات کا دلچسپ پیرائے میں ذکر کیا گیا ہے۔ قرۃ العین کا سفر نامہ صرف سفر کی روداد نہیں بلکہ عالمی منظر نامہ ہے۔ انہوں نے بہت سے مسائل پر گفتگو کی ہے۔ خاص طور پر خواتین اور مسلمانوں کے مسائل کو زیادہ ترجیح دی ہے۔ ان کے سفر نامے میں اسلوب کا فطری ارتقاء ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر انہوں نے ایک خاص پیرائے میں کیا ہے۔ زبان میں سلاست اور روانی ہے۔ سفر نامے کو پڑھتے وقت قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ سب مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ ''جہان دیگر'' میں جہاں افسانے جیسا لطف ہے وہیں تاریخ کے بارے میں بھی اہم معلومات فراہم کرائی گئی ہے۔

اردو ادب کے افق پر قرۃ العین حیدر(20 جنوری 1927۔21 اگست 2007) ایک ایسا چمکتا ستارہ ہیں، جس کی چمک کبھی ماند نہیں پڑ سکتی۔انہوں نے اردو نثر کے میدان میں ایسے گل بوٹے کھلائے کہ ادب کا دامن خوشنما ہو گیا۔اردو فکشن کو ایک نئے آہنگ سے اس طرح ہمکنار کیا کہ اردو ادب کو عالمی ادب کے مقابل بنا دیا۔فکشن میں اہم تجربے کیے۔ان کی تخلیقات قاری کے ذہن میں ایک نئی جہات کے دریچے وا کرتی ہیں۔افسانے، ناولٹ، ناول، سفرنامے، رپورتاژ، تراجم اور خودنوشت ایک ساتھ کئی اصناف میں طبع آزمائی کر کے انہوں نے اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کیا۔یہی وجہ ہے کہ قرۃ العین حیدر نے ایک منفرد فکشن نگار کی حیثیت سے ایسا مقام حاصل کیا ہے کہ رہتی دنیا تک قائم ودائم رہے گا۔ان کے کارناموں کی داستان کا ایک ورق ان کی سفرنامہ نگاری بھی ہے۔قرۃ العین حیدر کے دوسفرنامے''دکھلایئے لے جا کر اسے مصر کا بازار''(1976)اور'' جہان دیگر''(1979)ان کے بہترین سفرنامے ہیں۔دیگر نثری تخلیقات کی طرح سفرناموں کی بھی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ان میں سفر کے مشاہدات وتجربات کا دلچسپ پیرائے میں ذکر کیا گیا ہے۔

سفرنامہ نویسی ایک ایسا فن ہے، جو ہر خاص وعام کی دلچسپی کا سامان فراہم کرتا ہے، بلکہ سفرنامہ نگار اپنے انداز تحریر سے قاری کو بھی اپنا شریک سفر بنا لیتا ہے۔اس میں تاریخی حقائق، جغرفیائی صورتحال، تہذیبی رنگ وروایت کے عنصر موجود ہوتے ہیں۔قرۃ العین حیدر نے روداد سفر کو دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے اور دوران سفر پیش آنے والے تلخ وشیریں تجربات سے قاری کو مؤثر انداز میں روشناس کرایا ہے۔

''جہان دیگر''قرۃ العین حیدر کا اہم سفرنامہ ہے، جو سترہ ابواب پر مشتمل ہے۔مصنفہ نے ہر باب کا نام کسی دلچسپ واقعہ پر رکھا ہے۔ان عنوانات میں اتنی کشش ہے کہ وہ قاری کو پڑھنے کی طرف راغب کرتی ہے۔

''اڑن ہاتھی اور بڑھیا کا تنور، مور کی آخری آہ، گل آفتاب، صور اسرافیل، پیپل کا درخت، کہرے میں چھپے جزیرے، خیاباں خیاباں ارم، نادیہ لیلیٰ فاطمہ، ہواؤں کا شہر، دور کی بانسری کے سُر، سوپ اور پیرا ہن شنائٹی اسٹیٹ، فرشتوں کی ملکہ مریم کا شہر، کاؤبوائے اور ریڈ انڈین، تنہا ستارہ، ڈکسی مون، الفا اور اومیگا۔

سفرنامے میں مصنفہ نے امریکہ کے سفری احوال، تجربات ومشاہدات کو دلچسپ انداز میں قلم بند کیا ہے۔انہوں نے صرف خوبصورت مناظر کی ہی سیر نہیں کرائی بلکہ تلخ حقیقت کو بھی بیان کیا ہے۔ایک ایک چیز کا گہرائی سے مطالعہ کر کے قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔مصنفہ نے سفری

احوال کے ساتھ ساتھ سفر کے دوران ٹرین میں جن لوگوں کو دیکھا ان کا ذکر بھی کیا ہے۔مثال کے طور پر سامنے والی سیٹ پر ایک عمر رسیدہ خاتون بیٹھی ہیں، جو مائکروویوخرید کر لائی ہیں ان کے ساتھ ان کی بیٹی بھی ہے۔اور وہ اپنی بیٹی سے مائکروویوکا ذکر بڑی تفصیل سے کر رہی ہیں اور مائکروویوکی ایک ایک خوبی کو بیان کر رہی ہیں۔مصنفہ نے ماں بیٹی کی باتوں کو بڑے غور سے سنا اور نہ صرف سفر نامے میں درج کیا بلکہ اپنے ایک باب کا نام ہی ''اڑن ہاتھی اور بڑھیا کا تنور'' رکھ دیا۔جو قاری میں تجسس پیدا کرتا ہے۔

قرۃالعین حیدر نے قدم قدم پر زندگی کے نئے تجربات ومشاہدات سے قاری کو روشناس کرایا ہے۔اس سفر نامے کی یہ انفرادیت ہے کہ اس میں ماضی اور حال کا بیان ایک ساتھ افسانوی انداز میں ملتا ہے۔کہیں کہیں افسانے کی مانند فلیشبیک میں بھی سفر نامے کو آگے بڑھایا ہے۔مصنفہ نے جہاں امریکہ کی موجودہ صورتحال کا جائزہ لیا ہے وہیں ماضی کے حالات پر بھی بات کی ہے۔بلکہ انہوں نے ہزاروں سال کی تاریخ کو اس سفر نامے میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے:

''1567ء میں فلپ دوئم نے الحمراء کے تمام حمام توڑ ڈالے کہ مفتوح مسلمان نہانے سے باز آئیں۔زوال غرناطہ کے بعد وہ بے چارے ناکام گریلا لڑائیاں لڑتے پھرے۔مارے گئے۔مراکش جلاوطن ہوئے۔باقی ماندہ کو زبردستی بپتسمہ دیا گیا اور وہ مسیحی آبادی میں مدغم ہو گئے۔مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک ہسپانیہ کو یورپ کا دانش کدہ اور زرخیز ترین ملک بنائے رکھا۔ان کے خاتمہ کے بعد اندلس ایک بار پھر صحرا میں تبدیل ہوا۔نہریں اور کھیت خشک، مدارس ویران، نئے مفلوک الحال عیسائی ہسپانوی قسمت آزمائی کے لیے سمندروں پر نکلے۔بہت جلد بحیثیت ایک بد دماغ بے رحم امپیریل بحری طاقت اپنے عرب ورثہ کا غرور اور بانکپن اور موسیقی اور مورش طرز تعمیر ساتھ لیے وہ دنیا پر چھا گئے۔مشرق میں گوا، اور فلپائن۔شمالی امریکہ میں فلورائڈ، مغربی صحرا، کیلی فورنیا، میکزیکو، جزائر غرب الہند، سال جنوبی امریکہ۔سیاہ چشم ٹی وی اسٹار اور میڈرڈ سے آنے والا ہسپانوی فادر دونوں اپنے اس عرب ورثے سے لاعلم اور بے نیاز ہیں۔عرب امیج اس وقت یہ قمار باز پڑوڈالر پتی اور چونچ نما نقاب پہنے ان کے حرم کی عورتیں دنیا کے سامنے پیش کر رہی ہیں۔''

(جہان دیگر از قرۃالعین حیدر،ص،91)

سفرنامہ نگار نے مشرقی تہذیب اور مغربی تہذیب کا موازنہ بھی کیا ہے۔اور مغربی تہذیب کی طرف اہل مشرق کے رجحان کے جواز پر بھی بات کی ہے اور اس کی یہ وجہ بھی بتائی ہے کہ مغربی ٹیکنالوجی نے ہمیں اپنے حصار میں لے لیا ہے۔اس ضمن میں انہوں نے نہ صرف موجودہ صورتحال پر غور کیا ہے بلکہ سیکڑوں سال کی تہذیب کو بھی مدنظر رکھا ہے:

''یہودی مسیحی مغربی تہذیب کے سائنسی اور ٹیکنولوجیکل کارناموں سے بہرہ اندوز ہونے کے ساتھ ان میڈیول معاشروں میں ہلچل مچی اس کا نتیجہ ایران میں سامنے آچکا تھا۔اور عرب ممالک ایک بحران سے کسی لمحے بھی دوچار ہو سکتے تھے۔ شہزادی اور اس کے عاشق کا قتل اسی بحران کا ایک پہلو تھے۔ہم لوگ جو ڈیڑھ سو سال سے برطانیہ کی نوآبادی رہے اس اچانک بحران کا سامنا کرنے کے بجائے ان تبدیلیوں کے اثرات کو بتدریج جھیل گئے۔نظریاتی اور تہذیبی تصادم کا سامنا ہوشمندی سے سرسید اور ان کے ساتھیوں نے سو سال قبل کیا تھا۔خلیجی اور سعودیہ عرب اس ٹکراؤ سے دوچار تھے۔اور خلائی عہد کا قرون وسطیٰ کی دنیا سے یہ ٹکراؤ خوفناک اور لرزہ خیز تھا۔مغربی ٹیکنولوجی ہماری زندگیوں کا ایسا لازمی حصہ بن گئی ہے کہ ہم اس کے متعلق سوچتے بھی نہیں۔مرزا غالب کلکتہ میں صاحبان فرنگ کے کمالات دیکھ کر ہی انگشت بدنداں رہ گئے تھے۔آج مرزا غالب کے ساری دنیا میں ڈنکے بج رہے ہیں۔''

(ایضاً،ص۔76)

قرۃالعین حیدر نے سیکڑوں سال کی تہذیب کو اس سفرنامے میں سمونے کی کوشش کی ہے اور اگر کہیں بات پوری نہیں کہہ پائی ہیں تو انہوں نے وہاں پر اپنے سوانحی ناول ''کار جہاں دراز ہے'' کا حوالہ دیا ہے لیکن اپنے قارئین کو پوری پوری معلومات فراہم کرانے میں کامیاب رہی ہیں۔امریکہ کی ریاست کے بارے میں بتاتی ہیں کہ ہر ریاست کوئی نہ کوئی تخلص رکھتی ہے:

''امریکہ کی ہر ریاست ایک تخلص بھی رکھتی ہے۔مثلاً اری زونا۔''گرینڈ کینن اسٹیٹ''۔ ارکنسو''بہترین مواقع کی سرزمین''۔ کیلی فورنیا۔''گولڈن اسٹیٹ''۔ ڈیلاویر۔

''ڈائمنڈ اسٹیٹ''۔ فلوریڈا۔''سن شائن اسٹیٹ''۔ جارجیا۔ایمپائر اسٹیٹ آف دی ساؤتھ''۔ کینسی۔''گل آفتاب''۔ کین ٹکی۔''نیلی گھاس''۔ مین۔''صنوبر''۔ منی سوٹا۔ ''شمالی ستارہ''۔ مس پی۔''منگولیا''۔ نیوادا۔''سلور اسٹیٹ''۔ بنورجرزی۔''گارڈن اسٹیٹ''۔ نیویارک ۔''امپائر اسٹیٹ' (ایمپائر ۔ یعنی اول) ٹیکس۔''تنہا ستارہ''۔ واشنگٹن۔''سدا بہار''وغیرہ وغیرہ۔''(ایضاً،ص۔56)

اسی طرح مصنفہ نے ان تمام ریاستوں کی خوبیوں کے بارے میں بھی بتایا ہے اور اپنی تہذیب کے امتیازات بھی بیان کیے ہیں۔اور اپنے مشترکہ خاندانی روایت کا ذکر بھی کیا ہے۔ سفرنامے کے مطالعہ سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ مصنفہ کو پرانی قدروں سے لگاؤ ہے۔یہی وجہ ہے وہ بچپن کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو یاد کر کے محظوظ ہوتی ہیں، جب وہ امریکہ کی آزاد اور مصروف زندگی کو دیکھتی ہیں تو انہیں اپنا وطن یاد آتا ہے، جہاں سب کے پاس سب کے لیے وقت ہوتا تھا، وہ بچپن کی حسین وادیوں کی سیر کرنے لگتی ہیں اور ان کو اپنے وطن نہٹور کی مشترکہ خاندان کی روایتیں یاد آنے لگتی ہیں۔مصنفہ نے مشترکہ خاندان کی اہمیت کو اس طرح بیان کیا ہے:

''ہم لوگوں کے مشترکہ خاندان کی روایت کو یہ لوگ سمجھ نہیں سکتے۔'' آپا حمّن بولیں۔'' نہٹور میں یا جس جگہ بھی پورا خاندان جمع ہوتا۔کس قدر تفریح رہتی تھی۔ 1928ء کی بات ہے میں آٹھ نو سال کی تھی مگر اچھی طرح یاد ہے گویا کل کا واقعہ ہو۔سب سے پہلا فینسی ڈریس ہوا۔ مجھے یاد ہے سب میرٹھ میں جمع تھے۔امی جان کمہارن بنیں ابا جان کمہار۔چھوٹی چچی جان بہشتی۔ بڑے ابا بڑی اماں جوگی جوگن۔جوگن کے لیے ستار کسی ہندو دوست کے یہاں سے منگوایا گیا تھا۔وہ وقت پر پہنچا نہیں۔ چچا نثار حیدر مرحوم نے فی البدیہہ یہ نظم کہی۔اب بھلا دیکھو۔ ورمونٹ میں بیٹھ کر مجھے وہ بھولی بسری نظم یاد آئی۔

(ایضاً،ص۔70)

مصنفہ نے مغربی زندگی کا بغور مطالعہ کیا ان کے روزمرہ کو دیکھا اور خوبیوں کو سراہا اور اپنے ماحول سے موازنہ بھی کیا۔مغربی ماحول سے روشناس کرانے کے لیے کہیں بیانیہ کے طور پر

خود بیان کیا ہے اور کہیں مکالموں کے ذریعہ کسی دیگر کے ذریعہ بھی عکاسی کی ہے۔اس اقتباس میں مغرب کی نیوکلیئر فیملی پر مصنفہ نے اپنی بھانجی زیبا سے بڑے دلچسپ انداز میں تبادلۂ خیال کیا ہے:

''سان فرانسسکو سے بھانجی زیبا کی آواز آئی۔امریکہ میں ''نیوکلیر فیملی''، محض شوہر بیوی اور بچوں پر مشتمل ہے۔'' یہاں سب کچھ ہے بس ہیومن ریلیشن شپ ختم ہوگئے۔'' میں نے کہا'' گوسوچنے کی بات ہے کہ ہم لوگ نے مشرق میں اب تک کیا تیر مار لیے۔پڑے کھاٹ پر پان چبا رہے ہیں اور سمدھی کے سالے یا پھوپھی کی نند کی جیٹھانی سے گپ ہو رہی ہے۔'' شدید انفرادیت پرستی اور دوسرے شخص کی۔۔۔PRIVACY کا احترام اور اپنے کام سے کام رکھنا مغربی تہذیب کی خوبی ہے۔اور شدید خوداعتمادی بقول شخصے ہر امریکن مجسم منشور آزادی بنا پھرتا ہے۔اسی انفرادیت کی وجہ سے اس قوم نے اشتراکیت اور اشتمالیت کو ہوا بنا رکھا ہے۔''خوش حالی، تحفظ اور آزادی'' امریکن خواب'' کے اجزاء ہیں۔اور بوڑھوں کی خوداعتمادی کا یہ عالم ہے کہ نینسی کی والدہ پچھتر سالہ بزرگ خاتون ماشاء اللہ واشنگٹن ڈی۔سی سے کار خود ڈرائیو کرتی اتنا لمبا فاصلہ تنہا طے کر کے بیٹی اور داماد سے ملنے آتیں۔ پارے کے خسر دوسری جنگ عظیم سے قبل برطانیہ میں لیٹویا کے سفیر تھے۔ جنگ کے بعد لیٹویا سویٹ یونین میں شامل ہوگیا۔وہ وطن واپس جانے کے بجائے کینیڈا آ گئے۔وہ میاں بیوی مونٹریال میں رہتے ہیں۔جب کبھی بیٹی اور داماد سے ملنے آتے ہیں۔پارے کی بیوی ڈائنا باضابطہ شام کا لباس پہن کر کوک ٹیلز سرو کرتی ہیں۔ڈنر کے بعد کچھ دیر پر تکلف گفتگو ہوتی ہے۔اس کے بعد ماں باپ واپس۔ایک ہمارے ہاں نقشہ ہے۔کہ ہفتوں مہینوں عزیز و اقارب اور دوست ایک دوسرے کے یہاں پلنگوں پر نیم دراز گھنٹوں مسلسل گپ ٹھونک رہے ہیں۔ بلا اطلاع بن بلائے ایک دوسرے کے ہاں پہنچ گئے اور مسلسل گپیں اس قسم کی قبائلی اجتماعی بے تکلف طرز زندگی کا مغرب میں تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔''

(ایضاً، ص۔96)

اس اقتباس میں مغربی اور مشرقی زندگی کے روزمرہ کے معمولات کو سمویا گیا ہے۔لیکن یہ سفر قرۃ العین حیدر نے 1979ء میں کیا تھا، جب ہندوستان میں مشترکہ خاندان کا رواج تھا،لیکن موجودہ دور میں بہت کچھ تبدیل ہو گیا ہے مشترکہ خاندان بہت کم نظر آتے ہیں اور نیوکلیر فیملی ہی کا رواج ہو گیا ہے۔رہی عزیز و اقارب اور دوستوں کے گھر جانے کی بات تو یہاں پر بھی ہم نے مغربی ممالک سے بہت زیادہ اثر قبول کیا ہے۔اب یہاں پر بھی لوگوں کے پاس بہت کم وقت ہے۔اس لیے ملاقات فون پر ہی ہو جاتی ہے۔

قرۃ العین حیدر کے سفرنامے کی یہ خوبی ہے کہ وہ تصویر کا ایک ہی رخ سامنے نہیں لاتیں بلکہ دونوں پہلوؤں سے قارئین کو روشناس کراتی ہیں۔انہوں نے جہاں معربی ممالک کی خوبیوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے، وہیں خامیوں کو بھی بیان کیا ہے۔انہوں نے امریکہ میں ہونے والے نسلی تعصب کا ذکر بھی کیا ہے۔امریکیوں کی اس خامی پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہ بھی تشویش ظاہر کی ہے کہ یہ نسلی تعصب کبھی ختم نہیں ہوگا امریکی صرف کالوں ہی سے نفرت نہیں کرتے بلکہ وہ دنیا کے تمام مسلمانوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔بے جا آزادی جسے لوگ آج کے دور میں فیشن سمجھتے ہیں یا روشن خیالی تصور کرتے ہیں، مصنفہ نے اس کا باریک بینی سے جائزہ لیا اور اس پر طنز کے نشتر بھی لگائے ہیں۔وہ برکلے کے لزبین بار بھی گئیں اور ہم جنسوں کی زندگی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا۔امریکہ کی بیجا آزادی کو دیکھ کر وہ افسردہ ہو جاتی ہیں اور اس کو سماجی برائی گردانتی ہیں اور اس مقام پر وہ اپنی مشرقی تہذیب پر فخر محسوس کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ان کا خیال ہے اگر عورت مرد کو ساتھ رہنا ہے تو اس کے لیے شادی ضروری ہے۔بن بیاہی لڑکی کے ماں بننے کا قصہ مکالموں کے ذریعہ اس طرح بیان کرتی ہیں:

> ''تمہاری غیر موجودگی میں۔'' میری نے چائے پیتے ہوئے کہا۔''انٹرنیشنل رائٹنگ پروگرام میں ایک عدد ولادت ہوئی۔'' ''ولادت۔؟ کس کے ہاں۔؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔''بوجھو۔'' سوچا سمجھ میں نہ آیا۔اولگا؟ لیلے؟ ایگنس۔یا تھیا تو ہو نہیں سکتیں۔رہیں نادیا اور فاطمہ تو یہ دونوں غیر شادی شدہ ہیں۔'' ''پھر سوچو۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''فاطمہ''!

''فاطمہ ڈیکے؟''میں نے بھوچکی ہوکر دہرایا۔''مگراس کی شادی نہیں ہوئی اورنہ معلوم ہوتا تھا کہ۔۔۔''

''نیورمائنڈ''چندروز ہوئے رات کے دو بجے اس نے مجھے فون کیا۔فوراً ہسپتال لے گئے۔صحت مند بچی پیدا ہوئی۔اسے وہاں چھوڑ کر فاطمہ تیسرے دن نیویارک چلی گئی۔جہاں اس کا پلے شروع ہونے والا تھا۔''سخت جان،قوی ہیکل باغی افریقی لڑکی۔''نادیا نے کہا۔

''اس نے کسی کونہیں بتایا کہ بچی کا باپ کون ہے۔شاید وہ جنوبی افریقہ میں ہی موجود ہے اوراس کا ہم قوم ہے۔برٹ اورتھیا نے فاطمہ سے کہا ہے کہ اگر وہ چاہے تو بچی کو متبنہ کر کے ہالینڈ لے جائیں گے۔مگراس نے منظورنہیں کیا۔بن بیاہی کالی عورتوں کے یہاں بھی عام طور پر بہت بچے پیدا ہوتے ہیں۔اوراب گوریوں کے یہاں بھی بہت ہورہے ہیں۔یہ نئی اخلاقیات کی دنیا ہے۔مگرنہ جانے فاطمہ پر جنوبی افریقہ میں کیا افتاد پڑی ہو،کیا پتہ کسی نے اسے دھوکہ دیا ہو،نہ معلوم اس کے ذاتی مسائل کیا ہیں۔ممکن ہے اسے ریپ ہی کیا گیا ہو۔اسے جج کرنے یا اسے ہمدردی جتانے کا ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا۔''نادیا نے کہا جو اپنے رویوں میں بہت مغربی تھی۔یہی رویہ پروگرام کے باقی اراکین کا تھا۔اپنے کام سے کام رکھنے اوردوسروں کے معاملات میں ناک نہ ڈبو کے زریں مغربی اصول کے تحت کسی نے اس واقعہ کا اشارتاً بھی ذکرنہیں کیا۔''

(ایضاً،ص۔181)

اس طرح واضح ہوتا ہے کہ قرۃالعین حیدر مغربی ممالک کی بے جا آزادی سے کئی گنا بہتر مشرقی تہذیب وتمدن کو سمجھتی ہیں۔ان کا خیال ہے کہ مغربی تہذیب انسان کو وقتی طور پر چکا چوندھ کرسکتی ہے لیکن مشرقی تہذیب سے انسان وہ سب سیکھتا ہے جو پوری زندگی مشعل راہ بن سکتی ہے،اس کی روشنی میں وہ اپنی زندگی کی مشکل راہوں کو آسان بنا سکتا ہے۔اس سفرنامے کی خوبی یہ بھی ہے کہ جس واقعہ کو مصنفہ نے بیان

کیا ہے اس کے ساتھ پورا پس منظر بیان کیا ہے۔اور مؤثر انداز میں اپنے مقصد کو قلم بند کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر عالمی شہرت یافتہ ادیبہ تھیں، ان کی نظر عالمی مسائل پر رہتی تھی یا یوں کہا جائے عالمی مسائل کا انہوں نے بغور جائزہ لیا۔امریکہ کے سفر کے دوران ان کی نگاہ صرف امریکہ کے مسائل پر ہی نہیں رہتی بلکہ جس ملک میں بھی بے گناہ عوام کا قتل عام ہو رہا تھا اس پر بھی بات کی ہے۔انہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ انسانیت کے قتل کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ظلم کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔وہ ایران میں ہونے والے مظالم کا ذکر اس طرح کرتی ہیں۔

> ''اتنی خوبصورت، سہانی دلچسپ، مسرت بخش، فرحت انگیز دنیا اور چند انسانوں کو چند انسان سیاست کے نام پر پھانسی دے کر، گولی سے اڑا کر، زہر بم پھینک کر، خنجر جھونک کر اس عالم رنگ و بو سے معدوم کر دیتے ہیں۔آخر کیوں؟ ایران میں پچھلے برسوں میں کتنے مارے گئے۔اور اب بھی کتنے مارے جا رہے تھے۔''

(ایضاً، ص۔116)

مصنفہ کا یہ سفر ادبی تھا اسی لیے انہوں نے کئی سمیناروں میں شرکت کی اور کئی یونیورسٹی کا دورہ کیا۔ان کے اعزاز میں بہت سی تقریبات کا انعقاد کیا گیا۔مصنفہ نے کئی ادیبوں سے ملاقات کرائی ان کے خیالات سے روشناس کرایا اور وہاں پر اردو زبان کے استعمال پر تبادلۂ خیال کیا۔ اردو زبان جاننے والوں کا ذکر اس طرح کرتی ہیں:

> ''مغرب اور سوشلسٹ ممالک کی یونیورسٹیوں میں جو طالب علم برصغیر کی زبانیں پڑھنا شروع کرتے ہیں وہ اکثر اردو کو ترجیح دیتے ہیں۔نامور ہندی ادیب جب نجی طور پر بات چیت کرتے ہیں، تو بے ساختہ اور لامحالہ اردو بولتے ہیں۔لیکن اردو کی جو صورتحال ہے تو ہے۔عبرت۔عبرت۔ پریذیڈنٹس روم میں (جس کی دیوار پر یونیورسٹی کے سابق پریذیڈنٹوں کی تصاویر آویزاں تھیں) منعقد راقم الحروف کے سیمینار کے لیے (جس کا اعلان سان فرانسسکو کرانیکل میں چند روز قبل کیا جا چکا تھا) کافی سامعین موجود تھے۔اردو والے نازاں ہیں۔آہاہا۔دیکھئے صاحب مغرب میں بھی لوگ اردو پڑھ رہے ہیں۔بنکاک یا قاہرہ یا بغداد کی یونیورسٹیوں میں اردو پڑھائی

جائے تو اتنے مرعوب نہ ہوں گے۔"

(ایضاً،ص۔117)

مغرب میں فصیح و بلیغ اردو بولنے والوں سے ملاقات کر کے مصنفہ کو بہت اچھا لگا، وہاں پر ان سے ان کے ناولوں پر بھی گفتگو کی گئی۔"میرے بھی صنم خانے" کے موضوع پر سوال کیے گئے وہیں "پت جھڑ کی آواز" کی ہیروئن "تنویر فاطمہ" کی ابنارمل نفسیات کے بارے میں ذہین سوالات کیے گئے۔علاوہ ازیں پروفیسر برزونس پرے نے "کار جہاں دراز ہے" کے دوابواب "باغی سپاہی" اور "کچا پلئن اور کچا پائے مور" ریکارڈ کروائے۔قرۃ العین حیدر سے لکھنؤ اور دہلی کے تلفظ پر بھی گفتگو کی گئی۔

سفرنامہ نگار نے خواتین کے مسائل پر بھی بات کی اور نسائی ادب سے بھی تو شناس کرایا ہے، دیار غیر میں جہاں انہوں نے اپنی تخلیقات کا ذکر کیا وہیں۔دور اول کی خواتین تخلیق کار اکبری بیگم اور نذر سجاد حیدر کی تخلیقات پر بھی بات کی۔"جدید ہندوستان کی ہندو اور مسلم عورت" عنوان کے تحت سیمینار میں اپنی تقریر کا ذکر اس طرح کرتی ہیں:

> دوسرے روز یونیورسٹی میں "جدید ہندوستان کی ہندو اور مسلم عورت" پر لیکچر دینے سے قبل گیل نے تعارف کرواتے ہوئے نذر سجاد حیدر اور ان کی پھوپھی اکبری بیگم مصنفہ گودڑ کا لال کا تذکرہ کیا تھا۔لیکچر کے دوران مجھے گودڑ کے لال کی ثریا یاد آ گئی۔"مصنفہ نے اسے لاہور میڈکل کالج پڑھنے کے لیے بھیجا تھا۔جو گویا ہندوستانی عورت کی بغاوت اور آزادی کی علامت تھی۔مگر نقاب پہن کر ڈاکٹری کی تعلیم ممکن نہ تھی۔وہ بے حد حسین تھی تا کہ لوگ اس پر نظر نہ ڈالیں وہ چہرے پر سیاہ پوڈر مل کر کلاس میں جاتی تھی۔امریکن سامعین کو یہ قصہ انوکھا لگے گا۔مگر آج سے ستر سال پہلے ایک پردہ نشین مصنفہ نے جو تخلیقی اور اپنا آئڈیل کردار پیش کیا تھا۔وہ آج بھی ایک حد تک مشرقی عورت کا مسئلہ ہے۔روایت کی پابندی اور روایت سے انحراف۔

(ایضاً،ص۔156)

قرۃ العین حیدر نے امریکہ پہنچ کر بہت سے ادبی و علمی پروگراموں اور سیمینار میں شرکت کی۔ان پروگراموں میں مختلف مسائل پر تقریر کی۔اپنے مقصد کو بیان کیا خصوصاً خواتین کو پیش آنے

مسائل پر تفصیل سے اظہار خیال کیا۔حقوق نسواں پر بات کرتے ہوئے اسلام نے عورت کو کیا کیا اختیارات دئے ہیں،قرآن میں عورت کے کن کن حقوق کا ذکر آیا ہے،اس سے بھی روشناس کرایا ہے۔ اسلامی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے عورتوں کے حقوق کو اس طرح بیان کرتی ہیں:

''جس وقت میں نے کہا مغربی عورتوں کو شوہر سے علیحدہ اپنی جائداد رکھنے کا حق اب جا کر ملا ہے۔قرآن نے یہ حق چودہ سو برس قبل دیا تھا،اس وقت سامعین میں ایک امریکن لڑکی بالکل ٹھیک بالکل درست کہے جا رہی تھی۔''

(ایضاً،ص۔55)

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ قرۃ العین کا سفرنامہ صرف امریکہ کے سفر کی روداد نہیں بلکہ عالمی منظرنامہ ہے۔انہوں نے بہت سے مسائل پر گفتگو کی ہے۔خاص طور پر خواتین اور مسلمانوں کے مسائل کو زیادہ ترجیح دی ہے۔ان کے سفرنامے میں اسلوب کا فطری ارتقاء ہے۔چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر انہوں نے ایک خاص پیرائے میں کیا ہے۔زبان میں سلاست اور روانی ہے۔سفرنامے کو پڑھتے وقت قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ سب مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔''جہان دیگر'' میں جہاں افسانے جیسا لطف ہے وہیں تاریخ کے بارے میں بھی اہم معلومات فراہم کرائی گئی ہے۔سفرنامہ نگار نے نہ صرف لفظوں کے ذریعہ قاری کے سامنے تصویر پیش کی ہے بلکہ اپنے تاثرات وجذبات کا اظہار مؤثر انداز میں کیا ہے۔

☆☆☆

حواشی:

۱۔دکھلایئے لے جا کر اسے مصر کا بازار،قرۃ العین حیدر(1976)

۲۔جہان دیگر،قرۃ العین حیدر(1979)

سیما بھاٹی
Research Scholar, Maharaja Ganga Singh University, Rajasthan

منشی محمد حسین عاشقؔ دہلوی

ملخص:

منشی مولوی محمد حسین عاشقؔ دہلوی ۱۸۳۴ء میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام نورالدین احمد تھا جنھیں انھوں نے لکھنوی و ہلوی لکھا ہے۔یعنی وہ پہلے لکھنؤ، پھر دہلی میں رہے۔ان کی رہائش اجمیری دروازہ اور حوض قاضی کے درمیان تھی۔۱۸۵۸ء میں ریاستِ لوہارو میں میر منشی رہے۔۱۸۶۱ء میں محکمۂ کمشنری میں تعیناتی ہوئی،۱۸۸۱ء میں بیکانیر منتقل ہوگئے۔یہاں پہلے سجان گڑھ میں، پھر بیکانیر کے کوتوال مقرر ہوئے۔ ۱۸۸۳ء میں وہ سرسہ منتقل ہوئے جہاں ۱۸۸۶ء تک رہے۔۱۸۸۷ء میں وہ افسر عدالتِ دیوانی مقرر ہوئے جبکہ ۱۸۸۸ء میں بطور وکیل کوہِ آبو میں ان کی تعیناتی ہوئی۔

عاشق کے تین دیوان کا ذکر مالک رام اور لالہ ہری رام نے کیا ہے۔ہمیں ان کے دو ہی دیوان دستیاب ہو سکے۔ اول: افکار عاشق شاہد نظام ۱۳۰۱ھ، آصف جاہ میر محبوب علی شاہ والی دکن کو نذر۔ دوم: دیباچہ دیوان سوم موسوم بہ افکار عاشق ص ا تا ۳۔اس میں داغ دہلوی کے دیوان 'آفتابِ داغ' کی غزلوں کی زمین میں اشعار ہیں۔مزید اس میں رباعیات وقصائد بھی شامل ہیں جس میں برمدح سید حسن رسول نما قدس سرہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔علاوہ ازیں کلام امیر مینائی 'مراۃ الغیب' کی ردیف الف اور دوغزلہ ردیف ی قافیہ بہ قافیہ اور اسی دیوان میں شامل قصیدہ مناظرہ شانہ وآئینہ مناظرہ زلف ورخ کے نام سے لکھا ہے جس کے ہر شعر میں مدح آصف جاہ میر محبوب علی خان نظام دکن ہے۔بعد ازاں فارسی نثر میں دیباچہ آٹھ صفحات پر مشتمل بلاعنوان ہے جس میں حمد ونعت، خلفائے راشدین اور امام حسن وحسین کی منقبت کے بعد ان کا تعارف بھی ہے۔اس کے بعد فارسی غزلیات اور رباعیات غیر مخصوص بحروں میں ہیں۔انھوں نے اپنے خسر، بیوی، بیٹی اور نواسی کے انتقال پر بھی تاریخی قطعات کہے ہیں۔آخری حصے میں

تقاریظ وقطعات تاریخ شامل کیے گئے ہیں جن میں مولوی عبدالعلیم کاشانی، حکیم محمد حسن، مولوی نظیر حسین خاں سخا، مولوی محمد حفیظ اللہ بسمل خیرآبادی، سید افتخار حسین مضطر خیرآبادی، مولوی عبدالحئ، حکیم محمد عمر، محمد بخش ضبط، شاگردِ داغ شامل ہیں۔

منشی مولوی محمد حسین عاشق دہلوی ۱۸۳۴ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام نورالدین احمد تھا جنھیں انھوں نے لکھنوی و ہلوی لکھا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ پہلے لکھنؤ، پھر دہلی میں سکونت پذیر ہوئے۔ ان کی رہائش اجمیری دروازہ اور حوض قاضی کے درمیان تھی۔ وہ ۱۸۵۸ء میں ریاستِ لوہارو میں میر منشی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۸۶۱ء میں محکمۂ کمشنری میں تعیناتی ہوئی، پھر وہ ۱۸۸۱ء میں بیکانیر منتقل ہوگئے۔ یہاں پہلے سجان گڑھ میں ملازم رہے، پھر بیکانیر کے کوتوال مقرر ہوئے۔ ۱۸۸۳ء میں وہ سرسہ منتقل ہوئے اور ۱۸۸۶ء تک وہیں رہے۔ ۱۸۸۷ء میں وہ افسر عدالتِ دیوانی مقرر ہوئے جبکہ ۱۸۸۸ء میں بطور وکیل کوہِ آبو میں ان کی تعیناتی ہوئی۔ بقول حکم سنگھ سوڈھی:

وہ ۱۸۹۴ء تک کوہ آبو میں وکالت کے عہدے پر فائز تھے۔[۱]

حکم سنگھ سوڈھی کی کتاب ۱۸۹۴ء میں شائع ہوئی تب تک وہ یہیں تعینات تھے۔ مالک رام نے عاشق کی بیکانیر ملازمت کے سلسلے میں لکھا ہے۔ ۱۸۶۸ء میں بیکانیر چلے گئے اور آخر کار ۱۸۸۴ء میں ریجمنٹ گورنر جنرل اجمیر ریاست ہائے راجپوتانہ کے وکیل حاضر باش کے عہدے پر فائز ہوکر مدتوں اجمیر رہے۔[۲]

قابل ذکر بات یہ ہے کہ مالک رام کا یہ بیان حکم سنگھ سوڈھی کی فراہم کردہ معلومات سے ہم آہنگ نہیں۔ سوڈھی کے بیان اور دیگر شواہد کی بنیاد پر یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۴ء تک کوہ آبو میں تعینات تھے۔ اسی لیے اجمیر میں قیام کی بات مشکوک معلوم ہوتی ہے۔ لالہ شری رام نے ان کی شخصیت اور مزاج کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

پرانے سخن سنج تھے۔ دہلی کے مشاعروں اور قدیم صحبتوں کو دیکھ چکے تھے، مگر ان کی طبیعت نے ابتدا میں جو رنگ اختیار کیا تھا وہ آخر وقت تک نہ بدلا۔ ۱۸۵۸ء میں ریاست لوہارو میں ملازم تھے۔ ۱۸۶۸ء میں سرکار بیکانیر میں وظیفہ خوار ہوئے۔ ۱۸۸۴ء میں وکیل حاضر باش ریاست، ریجمنٹ گورنر جنرل راجپوتانہ ہوئے۔

چالیس سال تک مشقِ سخن میں مصروف رہے مگر اس میدان میں نہ آگے بڑھے نہ پیچھے ہٹے۔ معاملہ بندی کا عجیب ڈھنگ تھا۔ ان کی زود گوئی اور صفائی کے سامنے مضمون کا قافیہ تنگ تھا۔ اوائل سخن میں اساتذہ کی غزل پر غزل کہنے کا شوق تھا، اور ایک ایک قافیے کو کئی مرتبہ لکھتے، اور جب تک سامعین سے یہ نہ کہوا لیتے کہ آپ کا قافیہ دوسروں سے بڑھ گیا اس وقت تک ان کا پیچھا نہ چھوڑتے۔ آپ کو سخن فہم حضرات کی ہمیشہ تلاش رہتی۔ اپنے سامعین سے داد لینے کے لیے انھیں کئی روز تک اپنا مہمان رکھتے اور خاطر تواضع سے پیش آتے۔ چند ظرافت پسند لوگوں نے ان کے دل میں یہ بٹھا دیا تھا کہ آپ داغ سے بہتر کہتے ہیں۔ اسی بنا پر آپ نے حضرتِ داغ کے دو دیوانوں کا جواب قافیہ بہ قافیہ لکھا۔ کاتب کی غلطی سے جناب داغ کے دیوان میں ایک قافیہ غلط چھپ گیا تھا، آپ نے اس کا مطلق خیال نہ فرمایا اور اس کو آپ نے بھی اسی طرح باندھ دیا۔ حضرت ہر قسم کی نثر و نظم پر قدرت رکھتے تھے۔ تین دیوان اسرار عاشق، افکار عاشق اور اعجازِ عاشق ان کے یادگار ہیں۔ اپنے آپ کو مرزا غالب کا شاگرد بتاتے تھے۔ حضرت زکی دہلوی، مولانا راسخ، سوزاں وغیرہ کے ہم مشاعرہ اور بے تکلف دوست تھے۔ سیاہ فام آدمی تھے، مگر آپ کا باطن اور اخلاق تعریف کے قابل تھے۔ اکثر اپنے مکان پر مشاعرہ کرتے تھے۔ مرتبِ تذکرہ ایسی کئی صحبتوں میں شریک ہو چکا ہے۔ دہلی میں شاہ تارہ کی گلی میں ان کا مکان تھا۔[۳]

اسی نوعیت کی دیگر تفصیلات مالک رام نے ان کے مزاج اور شاعری کے بارے میں فراہم کی ہیں۔ بیان الحقائق کے مصنف کا بیان ہے کہ جن دنوں عاشق بیکانیر میں مقیم تھے انھوں نے اپنے دو مطبوعہ دیوان جو مرزا داغ کے ہر دیوان اور ہر غزل کے ردیف وار جواب میں تصنیف کیے تھے، مولانا سید عبید اللہ فرحتی (مصنف کے والدِ بزرگوار) کے آگے بہ مراد اصلاح کلام رکھ دیئے چنانچہ موصوف نے بصد توجہ بہت سے مواقع پر اصلاح پسندیدہ کی جس کو مولوی اقبال مرحوم نے بہ منت و سپاس قبول کر کے مکرر انطباع دواوین کا تہیہ و اہتمام کیا۔ عاشق کے دماغ میں سنک تو ضرور تھی اور ان سے کوئی فعل بھی بعید نہیں، مگر انھیں اپنی ہمہ دانی کا جو غرہ اور اپنی شاعرانہ عظمت کا جو زعم تھا اس کے پیش نظر یہ روایت حد درجہ مشکوک ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ عاشق نہایت زود گو اور نظم نثر پر یکساں حاوی تھے۔ زبان واقعی بہت صاف ہے۔[۴]

عاشق کے تین دیوانوں کا ذکر مالک رام اور لالہ ہری رام نے کیا ہے۔ ہمیں ان کے دو ہی دیوان دستیاب ہو سکے جن کی تفصیل یہ ہے۔

ا۔ افکار عاشق شاہد نظام ۱۳۰۱ھ، آصف جاہ میر محبوب علی شاہ والیِ دکن کو نذر، مطبع رائے بھوانی پرشاد

دہلی باہتمام احمد علی بیگ۔ رونق، مولوی منشی محمد اقبال عاشق دہلوی وکیل معتمد ریاست بیکانیر

۲۔ دیباچہ دیوان سوم موسوم بہ افکار عاشق ص ا تا ۳

وہ دیباچے میں تصریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اس میں داغ دہلوی کے دیوان ' آفتابِ داغ ' کی غزلوں کی زمین میں اشعار کہے ہیں۔ حضرتِ داغ کے دیوان دوم موسوم بہ آفتابِ داغ کی غزلوں کا از اول تا آخر مطلع سے مقطع تک ان ہی قوافی و ردیف میں ہم ردیف کیا۔ پھر اکثر غزلوں کی طرح بعد میں پورا کر کے بغیر قوافی کے آزادانہ غزلیں لکھیں اور ان کے سوا جو اس عرصے میں دیگر طرحوں میں متفرق غزلیں کہنے کا اتفاق ہوا تھا وہ بھی اسی میں ردیف وار درج کیں۔ زبان دہلی ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہوئی اور مستند زمانہ ہے، مگر مضامین کی آمد اور بندش کی ترکیب اپنے اپنے افکار اور لیاقت علمی کے موافق جداگانہ ہے۔ یہ ایک وہ طرز خیال کی گئی ہے کہ آج تک دیوان ہائے فارسی وار دو اساتذہ متقدمین ومتاخرین میں کسی میں نہیں دیکھی گئی۔ قدر دانان سخن و جوہر شناسان فن شاعری سے استدعائے داد ہے اور خطا پر عیب پوشی کی آنکھ پڑ جائے تو عین صاد ہے۔۵

غزلیات کے علاوہ اس میں رباعیات اور قصائد بھی شامل ہیں جس میں بر مدح حضرت سید حسن رسول نما قدس سرہ صفحہ ۱۶۵ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ امیر مینائی کے کلام مراۃ الغیب کی ردیف الف اور دو غزلہ ردیف ی صفحہ ۲۹۵ و ۲۹۶ قافیہ بہ قافیہ اور اسی دیوان میں شامل قصیدہ مناظرہ شانہ وآئینہ مناظرہ زلف ورخ کے نام سے لکھا ہے جس کے ہر شعر میں آصف جاہ میر محبوب علی خان نظام دکن کی مدح ہے۔ اس کے بعد فارسی نثر میں ایک دیباچہ آٹھ صفحات پر مشتمل (صفحہ ۲۳۹ تا ۲۴۶) بلا عنوان لکھا ہے جس میں حمد ونعت، خلفائے راشدین اور امام حسن وحسین کی منقبت کے بعد اپنا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔

خوشہ چین مزرعہ بزم آرایان محافل سخندانی و در یوزہ گر والا ہمتان ملک شیوا بیان احقر اعباد محمد اقبال حسین ولد منشی نور ادین احمد صاحب مبرو مغفور لکھنوی و دہلوی۔۶

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشی نورادین پہلے لکھنؤ میں رہتے تھے، بعد میں دہلی سکونت پذیر ہوئے۔ کتاب ہذا کی تقریظ کے بعد فارسی میں قصائد لکھے گئے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

ا۔ قصیدہ در حمدِ باری تعالی، بحر رمل، فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

۲۔ قصیدہ در نعتِ سرورِ کائنات، بحر ہزج مفاعیلین مفاعلین مفاعلین مفاعلین

۳۔قصیدہ درستایش ونیایش حضرت ابی بکر صدیق، در بحر خفیف فاعلاتن مفاعلن فعلات

۴۔قصیدہ در مدیح حضرت عمر ابن خطابؓ، بحر ہزج مفاعیلین مفاعلین مفاعلین مفاعلین

۵۔قصیدہ در ثنائے حضرت عثمان غنیؓ، بحر مجتث مفاعلن فعلا مفاعلن فعلات

۶۔قصیدہ در منقبت اسد اللہ الغالب حضرت علی ابن ابی طالبؓ، بحر ہزج مفاعلین مفاعلین مفاعلین مفاعلین

۷۔قصیدہ در مدح حضرت عبدالقادر جیلانی، بحر رمل، فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

۸۔قصیدہ در مدح خواجہ معین الدین چشتیؒ

۹۔قصیدہ در شان کرنل براڈفورڈ، رجمنٹ گورنر جنرل بہادر سابق راجپوتانہ، بحر رمل، فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

۱۰۔قصیدہ در توصیفِ میجر آئی سی ٹالبرٹ بہادر سی ای آئی، رجمنٹ بیکانیر، مفتعلن فاعلات مفتعلن فع

۱۱۔قصیدہ در تہنیت عید در شان منشی دیوان امین محمد مدار المہام راج بیکانیر، مفاعلان فعلات مفاعلن فعلات

۱۲۔قصیدہ در تہنیت عید الاضحیٰ در شان منشی دیوان امین محمد مدار المہام راج بیکانیر

اس کے بعد فارسی غزلیات اور دیگر اصناف پر مشتمل دیوان ہے جس میں ہر غزل پر اس کی بحر لکھی گئی ہے۔اسی طرح رباعیات پر بحر لکھی گئی ہے، مگر رباعی ان بحور میں کہی گئی ہے جو اس سے مخصوص نہیں۔اس میں انھوں نے اپنے خسر، بیوی، بیٹی اور نواسی کے انتقال پر بھی تاریخی قطعات کہے ہیں۔ آخری حصے میں تقاریظ وقطعات تاریخ شامل کیے گئے ہیں جن میں مندرجہ ذیل حضرات شامل ہیں۔

۱۔مولوی عبدالعلیم کاشانی، المتخلص بہ عاصم ساکن کلکتہ

۲۔حکیم محمد حسن حسن خلف حکیم سید منور علی خاں آشفتہ دہلوی

۳۔مولوی نظیر حسین خاں سخاؔ

۴۔مولوی محمد حفیظ اللہ، نیو ڈاکٹر شفاخانہ اجمیر شریف، شاگرد رشید حضرت غالب متخلص بہ طالب

۵۔بسمل خیر آبادی، وکیل معتمد ریاستِ ٹونک، راجپوتانہ کوہ آبو

۶۔سید افتخار حسین مضطر خیر آبادی، برادرِ عزیز بسمل خیر آبادی

۷۔مولوی عبدالحی جوڈیشیل آفیسر ریاست سروہی

۸۔حکیم محمد عمر خلف حکیم عبدالحی بیگ ملازم راج تاجور الور

۹۔محمد بخش ضبط، شاگردِ داغ

(اسرارِ عاشق ملقب بہ دیوانِ عاشق ۱۸۹۰ء از اقبال حسین عاشق دہلوی وکیل معتمد راج بیکانیر)

غزلیات-۱۹۴ص ۲ تا ۱۵۵۔ مخمس برغزل خواجہ میر دردؔ ص ۱۵۵ تا ۱۵۶۔ رباعیات ص ۱۵۶ تا ۱۵۹۔

خط منظوم بہ جواب ڈاکٹر محمد حفیظ اللہ، ڈاکٹر سابق کوہ آبو و بھیلی واڑہ، علاقہ اودے پور، حال اجمیر شریف ص ۱۶۲ تا ۱۶۵۔ دوسہرے۔ قصیدے (جن کی تفصیل یہ ہے)

۱۔ قصیدہ نعتیہ مع سراپائے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم-۱۴۴/ اشعار

۲۔ قصیدہ در مدح خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیری-۱۲۸/ اشعار

۳۔ قصیدہ در توصیف وشان بہ جناب مستطاب فضائل خطاب اوائل طہاب حضرت دیوان شیر محمد خان صاحب بہادر وقار اللہ عین باکمال (آمین)

۵۔ قصیدہ در مدح جناب معلیٰ القاب منشی امین محمد صاحب دام اقبالہٗ

غزلیں ردیف ہائے متفرق جو بعد طبع دیوان تصنیف ہوئیں (۱۴ غزلیں)

تاریخ وفات دختر و نواسی (۱۸۸۸ء اور ۱۳۰۸ھ)

تقاریظ قطعات تاریخ:

۱۔ تقریظ سید محمد حسین المتخلص بہ بسمل خیرآبادی وکیل معتمد ریاستِ ٹونک، مقیم کوہِ آبو

۲۔ تقریظ مولوی عبدالحی بیخود دہلوی، جوڈیشیل آفیسر دربارِ ریاست سروہی

۳۔ تقریظ سید افتخار حسین متخلص بہ مضطر نائب وقائم مقام وکیل ریاستِ ٹونک، برادرِ عزیز حضرتِ بسمل

۴۔ حکیم سید محمد محسن خاں حسنؔ

۵۔ تقریظ حامد حسین خاں حامدؔ خلف حکیم سید محمد محسن خاں حسن

۶۔ قطعہ تاریخ سید حامد حسین

۷۔ قطعۂ تاریخ الطاف حسین حالی

۸۔ قطعۂ تاریخ داغ دہلوی

۹۔ مولوی عبدالقدوس قدسی ایڈیٹر اخبار صحیفہ دہلی

۱۰۔ محمد اکرام اللہ اکرام

۱۱۔ مرزا بسم اللہ بیگ بسمل

۱۲۔حکیم محمد عنبر

۱۳۔حکیم محمد عبدالحی شاہجہاں آبادی مقیم حال ریاست الور

۱۴۔قطعہ در مدح دیوان عاشق سید احمد عاشق خلف الصدق سید نظام الدین

انتخاب کلام دیوان

اول تھا وہم دوئی تفرقہ پرداز وگرنہ جس مرتبہ تو دور تھا اتنا ہی قریں تھا
اچھا میں برا سہی و لیکن تم اپنی کہو تمھیں ہو ا کیا
عشق میں بس یہ ہنر پیدا کیا کچھ نہ رکھا جس قدر پیدا کیا
جو نمک زخموں پہ چھڑکتے رات دن چارہ گروہ ڈھونڈ کر پیدا کیا
چشمِ میگوں سے تری مست ہے عالم ساقی پھر خبر کس کو کہ یہ نشۂ صہبا کیسا
اے جنوں شوق ہو کیوں بادیہ پیمائی کا گھر ہی ویرانے سے بہتر ہے تو صحرا کیسا
ہائے کس ناز سے کہتے ہیں وہ مجھ سے ہر دم اپنی صورت کو تو دیکھو تمھیں چاہیں کیوں کر
تمناؤں کی رخصت ہے تو ارمانوں کی آمد ہے مسافر سینکڑوں مہماں سرائے دل میں رہتے ہیں
وہ دل ہے خاک جس میں تری آرزو نہ ہو وہ گل ہے خار جس میں محبت کی بو نہ ہو

از دیوان سوم

آنکھ جادو تھی مگر اس کو نہ چلتے دیکھا زلف ناگن تھی مگر من نہ اگلتے دیکھا
تیرہ بختی مری شبِ وصل آئی کام چھا گئی ایسی کہ سورج کو نکلنے نہ دیا
شوخی نے رخنے ڈال دیے ہیں نقاب میں سو بے حجابیاں ہیں تمھارے حجاب میں
غیر فتنہ تو ہے نہیں کہ اٹھایا اس کو میں قیامت تو نہیں ہوں کہ اٹھا دیتے ہیں

☆☆☆

حواشی:

۱۔سوانح عمری رؤسا و شرفائے بیکانیر، جلد اول، مصنفہ رائے بہادر سوڈھی حکم سنگھ، مطبوعہ جیل پریس بیکانیر، ۱۹۴۹ء، ص ۶ تا ۷

۲۔تلامذۂ غالب، مالک رام، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء، ص ۳۹۷

۳۔خم خانۂ جاوید، جلد پنجم ۱۹۴۰ء، دہلی، ص ۵۲۹ تا ۵۳۰

۴۔تلامذۂ غالب، مالک رام، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء، ص ۳۹۷ تا ۳۹۸

۵۔افکار عاشق۔مولوی منشی محمد اقبال عاشق دہلوی وکیل معتمد ریاست بیکانیر۔صفحہ ۳۔مطبع رائے بھوانی پرشاد دہلی

مظفر حسین
Research Scholar, Department of Political Sceince, MANUU, Hyderabad

جنوبی ایشیا میں CPEC کی اہمیت اور مضمرات
ہندوستانی نقطہ نظر کے حوالے سے

تلخیص

چین پاکستان تعلقات کے حوالے سے CPEC جنوبی ایشیا میں ایک اہم تشویش بن گیا ہے۔ پاکستان اور چین بہت گہرے دوست ہیں اور تاریخ بتاتی ہے کہ ان دونوں ممالک نے ہر حال میں ایک دوسرے کی مدد کی۔ اس وقت چین پاکستان اقتصادی راہداری کی ترقی سے دونوں ممالک ایک بار پھر قریب آ رہے ہیں۔ چین نے 2013 میں اس راہداری کی تجویز دی تھی جسے پاکستان نے قبول کر لیا تھا اور پاکستان اور چین کے نمائندوں کے درمیان باضابطہ طور پر مفاہمت کی یادداشتوں پر دستخط کیے گئے تھے۔ CPEC پاکستان اور چین دونوں کے لیے فائدہ مند ہوگا۔ اس سے پاکستان کے پسماندہ علاقے بلوچستان جیسے ترقی کریں گے اور بدلے میں چین کو مشرق وسطیٰ سے تیل لانے کے لیے سیدھی اور مختصر ترین سڑک ملے گی۔ دوسری جانب بھارت CPEC کی ترقی کے مکمل خلاف ہے اور اس راہداری کو کسی بھی طرح سے روکنے کے لیے مختلف طریقوں سے رکاوٹیں ڈال رہا ہے۔ بھارت ہر فورم پر چین پاکستان اقتصادی راہداری کے خلاف سختی سے بات کر رہا ہے اور اسے سیاست اور سفارت کے ذریعے پٹری سے اتارنے کی کوشش کر رہا ہے۔

کلیدی الفاظ: چین، پاکستان، ہندوستان، CPEC، جنوبی ایشیا، بلوچستان۔

پاکستان اور چین کے درمیان دوطرفہ تعلقات نوآبادیاتی طاقتوں کے ذریعے آزادی کے آغاز سے ہی استوار رہے ہیں۔ دونوں ریاستوں نے اپنے تعلقات کو پوری تاریخ میں ایسے دوستانہ انداز میں ڈالا

کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ اور جاذبِ نظر ہو گئے۔ دونوں اطراف کے رہنماؤں نے بار بار اپنے تعلقات کو ''پہاڑوں سے بلند اور سمندروں سے گہرا'' کہا۔ موجودہ دور کی بین الاقوامی سیاست میں یہ رشتہ ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ یہ اس سے بھی زیادہ توجہ کا مرکز لگتا ہے جب ہمیں ان دو ریاستوں کے درمیان کوئی مشترکہ مذہب، زبان یا ثقافت نہیں ملتی۔ دونوں ریاستیں دو مختلف تہذیبی، تاریخی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی سیٹ اپ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان تمام اختلافات کے باوجود پاکستان اور چین نے اتنے اچھے تعلقات استوار کیے ہیں کہ یہ اختلافات ان کے دوطرفہ تعلقات کو خراب کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رکھتے۔ حقیقت پسندانہ طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں فریقوں کے مشترکہ مفادات ہیں جنہوں نے ان دونوں ریاستوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔ مزید برآں، جیو اسٹریٹیجک حقائق اور بدلتے ہوئے بین الاقوامی طاقت کے ڈھانچے نے ان مثالی تعلقات کو استوار کرنے کے لیے حالات فراہم کیے ہیں۔ لہٰذا دونوں اطراف کے پالیسی ساز علاقائی پالیسیاں بناتے وقت ایسی حقیقتوں کو ہمیشہ ذہن میں رکھتے ہیں۔ تاہم اس بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ پاک چین تعلقات اب تک کئی طریقوں سے منفرد ہیں۔

گوادر پورٹ کی ترقی ان دونوں ریاستوں کے درمیان تعلقات میں ایک اور اہم پیش رفت ہے۔ اس پروجیکٹ نے دونوں ریاستوں کے لیے بے شمار مواقع فراہم کیے ہیں۔ جنوبی ایشیا کے خطے کے لیے گوادر پورٹ کی سٹریٹجک اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ چین پاکستان اقتصادی راہداری (CPEC) دونوں شراکت داروں کے درمیان تازہ ترین منصوبہ ہے۔ سال 2015 میں چینی صدر کے دورہ پاکستان کے دوران اس پر ایک مستحکم طریقے سے دستخط ہوئے تھے۔ یہ منصوبہ دراصل ون بیلٹ ون روڈ (OBOR) انیشیٹو کے چینی وژن کا ایک ذیلی حصہ ہے۔ اس کا مقصد شراکت داروں کے درمیان اقتصادی سرگرمیوں کو بڑھانا ہے۔ ابتدائی طور پر اس منصوبے کی مالیت 46 بلین ڈالر تھی، جب چینی سرمایہ کاری میں اضافہ ہوا اور سال 2020 میں یہ 62 بلین ڈالر کا ہندسہ عبور کرگی۔ منصوبے کا مقصد معیشت، تجارت، توانائی، زراعت اور مواصلات کی ترقی ہے۔ تمام فوائد کے علاوہ CPEC نے بے مثال اسٹریٹجک مواقع فراہم کیے ہیں۔ اگرچہ اس پروجیکٹ کو تجزیہ کاروں کے کچھ گروپ کی جانب سے تنقید کا سامنا ہے لیکن مجموعی طور پر یہ پروجیکٹ دونوں شراکت داروں کے لیے فائدہ مند ہے۔ چین کی نظر میں اس منصوبے کا بنیادی مقصد چین کے مغربی حصے کی

ترقی ہے جو کہ چین کا نسبتاً پسماندہ خطہ ہیاور چین کا مقصد بھی اسے بحیرہ عرب سے ملانا ہے۔ یہ افریقہ، یورپ اور خلیجی ریاستوں کے ساتھ چین کی تجارت کو وسعت دے گا۔ گوادر نے چین کو دنیا کے دیگر حصوں تک پھیلایا اور پورے خطے کے ساتھ تجارت کا مختصر ترین راستہ فراہم کیا ہے۔ CPEC نے چین کو ''ملاکا مخمصے'' سے نکلنے میں مدد کی۔ گوادر بندرگاہ نے اپنی سمندری لائن کو محفوظ بنانے اور تیل کی بلا تعطل فراہمی کا موقع فراہم کیا۔ چین مشرقی ایشیائی ریاستوں کے اتحاد کے امکان کے بارے میں بھی غیر محفوظ محسوس کر رہا تھا۔ دوسری طرف امریکہ جنوبی بحرالکاہل کے خطے میں اپنی بالادستی برقرار رکھنے کے لیے مشرقی ایشیائی ریاستوں کے ساتھ بھی تعلقات استوار کر رہا ہے۔ پاکستان نے اپنی گوادر بندرگاہ اور سمندری راستوں سے چین کو اس خطے میں بھارت کا مقابلہ کرنے کی پوزیشن فراہم کی۔ اپنی سٹرنگ پرل پالیسی کے ذریعے، چین نے جنوبی ایشیا کی کچھ دیگر علاقائی ریاستوں کو شامل کیا جن میں پاکستان، سری لنکا، برما اور بنگلہ دیش شامل ہیں۔ اس لیے ان ریاستوں کی شمولیت نے چین کو اس قابل بنایا کہ وہ جنوبی ایشیا میں اپنے تسلط پسندانہ عزائم کو پورا کرنے کے لیے بھارت کو روکنے کے لیے اسٹریٹجک پوزیشن حاصل کر سکے۔

چین پاکستان اقتصادی راہداری (CPEC):۔

چین پاکستان اقتصادی راہداری بیجنگ اور اسلام آباد کے لیے تجارتی ترقی، علاقائی روابط اور بنیادی ڈھانچے کی ترقی کو فروغ دینے کے لیے ایک بہت بڑا پلیٹ فارم فراہم کرتا ہے۔ چین پاکستان اقتصادی راہداری (CPEC) چین کے بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو (BRI) کا 46 بلین ڈالر کا فلیگ شپ منصوبہ ہے، اور اس کو 2015 کے آغاز سے ہی پاک چین تعلقات میں ایک تاریخی لمحہ قرار دیا گیا۔ اسلام آباد بیجنگ کے لیے ایک اہم اتحادی ہے، کیونکہ یہ چین کو وسطی ایشیا، جنوبی ایشیائی خطے اور مشرق وسطیٰ سے جوڑتا ہے۔ اور گوادر کی گہری سمندری بندرگاہ بحر ہند اور اس سے آگے تک براہ راست رسائی فراہم کرتا ہے۔ دونوں ممالک اپنے باہمی مفادات کے تحفظ کے لیے اپنے رابطوں اور اسٹریٹجک رابطے کو بہتر بنانے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ CPEC پیچیدہ اور بدلتی علاقائی اور بین الاقوامی حرکیات کے تناظر میں چین پاکستان تعاون کے ایک نئے ماڈل کی نمائندگی کرتا ہے۔ CPEC زمینی اور سمندری راستوں کے درمیان ایک پل کا کام کرتا ہے اور یہ بیجنگ کو بحیرہ عرب

اور بحر ہند اور اس سے آگے چین کے کاشغر اور پاکستان کی گوادر بندرگاہ کے درمیان 2500 کلومیٹر زمینی راستے سے جوڑتا ہے۔ یہ واحد راستہ ہے جو بیجنگ کو بحر ہند تک براہ راست رسائی فراہم کرتا ہے۔ CPEC میں بیجنگ کی سرمایہ کاری دونوں ممالک کی تاریخ میں سب سے بڑی سرمایہ کاری ہیجو اسلام آباد میں چین کے اعلیٰ داؤ کو ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

چین پاکستان اقتصادی راہداری کے چند اہم اہداف درج ذیل ہیں:۔

1۔ اسلام آباد ہائی ویز اور ریلوے کے ایک بڑے نیٹ ورک کا مقام۔

2۔ گوادر اور کراچی کی بندرگاہوں کو شمالی پاکستان سے ملانا۔

3۔ کراچی پشاور میں ریلوے لائن کی اپ گریڈیشن۔

4۔ کراچی اور لاہور شہروں کے درمیان 1100 کلومیٹر لمبی ہائی وے کی تکمیل۔

5۔ پاکستان کے ریلوے نیٹ ورک کی بیجنگ کے جنوبی سنکیانگ ریلوے کاشغر تک توسیع۔

چین کے لیے CPEC کی اہمیت:۔

مشرق وسطیٰ تیل کے حوالے سے ایک اہم خطہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا کا نصف سے زیادہ تیل مشرق وسطیٰ میں محفوظ ہے۔ امریکہ اور چین جیسے ترقی یافتہ ممالک دنیا کے اس حصے کی طرف جھکاؤ رکھنے کی حکمت عملی رکھتے ہیں۔ چین اس وقت خلیج فارس (Persian Gulf) کے مختلف ممالک سے تیل حاصل کر رہا ہے۔ چین کو تیل لانے کے لیے طویل فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے اور اسے آبنائے ملاکا (Strait of Malacca) جیسے کئی متنازعہ علاقوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔

دنیا کا تقریباً 40 فیصد تیل خلیجی خطے (Persian Gulf) میں محفوظ ہے اور اس تیل کو باقی دنیا تک پہنچانے کے لیے خلیج فارس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ چین کے ترقی پسند راستے میں رکاوٹیں بحر ہند میں ہندوستانی اور امریکی سرگرمیوں کی شمولیت ہے۔ چین CPEC کو جلد از جلد مکمل کرنے کے لیے بہت متجسس ہے کیونکہ یہ اسے مشرق وسطیٰ سے خام مال لانے کے لیے متبادل راستہ فراہم کرے گا۔

چین ایک مخالف راستہ دریافت کرنا چاہتا ہے جس سے وہ مشرق وسطیٰ، افریقہ اور یورپ سے رابطہ کر سکے گا کیونکہ یہ حصے تجارت کے حوالے سے غالب خطے ہیں۔ CPEC چین کے لیے اس طویل روٹ سے چھوٹا راستہ فراہم کرے گا جو اس وقت چین استعمال کر رہا ہے۔ CPEC کا

بنیادی ڈھانچہ نجی شعبوں کو پاکستان کے راستے دوسرے ممالک کے ساتھ زیادہ حصہ لینے کے مواقع فراہم کرے گا۔ یہ چین کے سرمایہ کاروں کو ایک محفوظ اور تنازعات سے پاک راستہ فراہم کرے گا۔

پاکستان کے لیے CPEC کی اہمیت:۔

2014 میں، پاکستان نے چین کے ساتھ کرنسی کے تبادلے پر دستخط کیے جس سے پاکستان جنوبی ایشیا کا واحد ملک بن گیا جس نے چین کے ساتھ ایسا منفرد اقدام شروع کیا۔ چین پاکستان کا دوسرا بڑا تجارتی شراکت دار ہے اور دونوں ہمہ وقت دوست ہیں۔ چین پاکستان میں سب سے بڑا سرمایہ کار ہے۔ پاکستان میں متعدد چینی کمپنیاں مختلف تجارتی اور اقتصادی شعبوں میں کام کر رہی ہیں۔ CPEC پاکستان کے لیے گیم چینجر ثابت ہوگا کیونکہ اس سے پاکستان کی پوری شکل بدل جائے گی۔ CPEC کے حوالے سے پاکستان کو بنیادی ڈھانچے کی بہتر سہولیات میسر ہوں گی۔ یہ پاکستان میں ملازمت اور سرمایہ کاری کے مواقع بھی فراہم کرے گا۔ چین پاکستان اقتصادی راہداری پاکستان کو دنیا کا تجارتی مرکز بنائے گی۔

اگر چہ CPEC کے ساتھ بہت سے سماجی اور سیاسی مسائل جڑے ہوئے ہیں لیکن اس کے پاکستان اور چین دونوں کے لیے بے شمار فوائد ہیں۔ اس وقت پاکستان کو بہت سے مسائل کا سامنا ہے اور سب سے اہم مسئلہ (Energy Crisis) توانائی کا بحران ہے۔ CPEC سے توانائی کے بحران کے مسئلے کو حل کرنے میں مدد ملے گی کیونکہ توانائی کے شعبے کے لیے بہت بڑی سرمایہ کاری مختص ہے۔ یہ منصوبہ پاکستانیوں کو مختلف نسلوں اور رنگوں کے لوگوں سے بات چیت کا موقع فراہم کرے گا۔ CPEC پورے ملک کے بنیادی ڈھانچے کو بہتر بنائے گا جیسے سڑکیں، ریلوے لائنیں وغیرہ۔

CPEC پر بھارت کا ردعمل:۔

چین کے کنیکٹیویٹی ڈائس (Connectivity Dice) نے ہندوستان کو الجھن میں ڈال دیا ہے۔ ہندوستان کو اسلام آباد میں بیجنگ کی بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری پر بھی تشویش ہے خاص طور پر اس کے حالیہ فیصلے کا جو چین پاکستان اقتصادی راہداری کو فنڈ دینے کے طور پر ہوا۔ چین چینی ساختہ کیوشوری ایکٹر (Chinese Built Kyshu Reactor) میں پلوٹونیم (Plutonium) بنانے میں بھی پاکستان کی مدد کر رہا ہے اور 5 بلین ڈالر مالیت کی 8 آبدوزیں

(Submarines) فروخت کرے گا، جس سے پاکستان کی بحریہ کی سمندری صلاحیت میں کوانٹم لیپ (Quantum Leap) ہوگا۔ اس بنیادی ڈھانچے کے منصوبے (CPEC) کو حتمی شکل دینے کے بعد، گوادر پورٹ مکمل طور پر فعال ہونے اور ڈیوٹی فری اقتصادی زونز (Economic Zones) کے قیام کے بعد پاکستان ایک علاقائی تجارتی مرکز بن سکتا ہے۔ کئی وسطی ایشیائی ممالک نے بھی اس راہداری کا حصہ بننے کے حوالے سے دلچسپی ظاہر کی ہے۔ بیجنگ اور اسلام آباد کے درمیان اس سٹریٹجک اتحاد نے بھارت کو ناراض کر دیا ہے جس نے کھل کر اس حد تک اپنی مخالفت کا اظہار کیا ہے بھارتی وزیراعظم نریندر مودی نے اپنے دورہ چین کے دوران چینی صدر کو راہداری کے منصوبے کو ترک کرنے پر راضی کرنے کی کوشش کی کیونکہ بھارت نے اس خیال کو ناقابل قبول بتایا تاہم چین نے دباؤ میں آنے سے انکار کر دیا اور اس منصوبے پر کام جاری رکھنے کے عزم کا اظہار کیا۔ اس نے ہندوستان کو پیچھے پڑنے سے بچنے اور دونوں ممالک کے ساتھ اپنی سیاسی مخالفت کو برقرار رکھنے کے لیے نئے اسٹریٹجک شراکت داروں کی تلاش میں دھکیل دیا۔

چین پاکستان اقتصادی راہداری کے افتتاح کے پہلے دن سے ہی بھارت نے اس کے خلاف ایک غیر متفق پالیسی اپنائی ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں نئی دہلی پاکستان کو باقی خطے سے الگ تھلگ کرنے کی اپنی حکمت عملی کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ بھارت کی طرف سے اس طرح کی پالیسی نے پڑوسی ملک کے ساتھ خش کوار روابط کی ایک اور وجہ کو جنم دیا ہے۔ نئی دہلی کو CPEC روٹ کے بارے میں تشویش ہے جو پاکستان کے زیر انتظام کشمیر اور گلگت بلتستان سے گزرتا ہے۔ ہندوستان کا دعویٰ ہے کہ پاکستان کے زیر انتظام کشمیر اور گلگت بلتستان اب بھی متنازعہ علاقے اور ہندوستان کے زیر انتظام کشمیر کا حصہ ہیں اور اس لیے وہ ان پر پاکستان کے کنٹرول سے انکار کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ منصوبہ ہندوستانی دفاع کے لئے فائدہ مند نہیں اور دہشت گردی اور سرحدی تنازعے کا مسئلہ بھی ہے۔ ان دونوں ملکوں کے تعلقات بھی ہندوستانی دفاعی پالیسی کے لئے تشویش کا باعث ہیں۔ اس مسئلے میں ملک کی بقا کے لئے ہندوستان کو اور زیادہ ٹھوس اور موثر اقدام کرنے کی ضرورت ہے۔

جنوبی ایشیا میں CPEC کے مضمرات:۔

چین پاکستان اقتصادی راہداری پاکستان اور چین کے درمیان تقریباً 3,000 کلومیٹر

طویل نقل وحمل کی راہداری ہے۔ یہ گوادر (بلوچستان) سے شروع ہوکر کاشغر (چین) سے جڑے گا۔ دونوں حکومتیں بہت سے دیگر علاقائی اور عالمی ممالک کی مخالفت کے باوجود اس منصوبے کی تکمیل کے لیے پرامید ہیں۔ بنیادی طور پر بھارت اور امریکہ پاکستان اور چین کے درمیان ہونے والے اس باہمی معاہدے سے خوش نہیں ہیں۔ بھارت کے پاکستان اور چین دونوں کے ساتھ ہموار تعلقات نہیں ہیں اسی لیے سی پیک کے ہموار راستے میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔ دوسری جانب امریکا نے بھی CPEC کی بالواسطہ مخالفت کی کیونکہ چین اگلی سپر پاور کے طور پر امریکا کے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بجا رہا ہے۔ یہ دونوں الزام لگا رہے ہیں کہ یہ راستہ صرف اقتصادی فائدے کے لیے نہیں بلکہ فوجی مقاصد کے لیے بنایا جا رہا ہے۔

پاکستان کا سٹریٹجک محل وقوع بہت اہم ہے کیونکہ یہ ایک ایسی اہم جگہ پر واقع ہے جو جنوبی ایشیا کو مشرق وسطیٰ اور وسطی ایشیا وغیرہ سے جوڑ سکتا ہے اسی لیے چین اس خطے میں اتنی بڑی سرمایہ کاری کر رہا ہے کیونکہ CPEC کی وجہ سے یہ مزید فوائد حاصل کریں. یہ چین کو مشرق وسطیٰ سے جڑنے کے لیے مختصر ترین راستہ فراہم کرے گا۔

2015 میں پاکستان میں CPEC کی صورت میں ایک تاریخی واقعہ رونما ہوا جو جنوبی ایشیا کی پوری شکل کے ساتھ ساتھ تجارت کی عالمی شکل کو بدل دے گا۔ جنوبی ایشیا تیسری دنیا کے ممالک کا حصہ ہے جس کے رکن ممالک زیادہ تر ترقی پذیر ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک نے یہاں صنعتیں لگا رکھی ہیں۔ وہ یہاں خام مال لاتے ہیں اور تیار شدہ اشیاء کو صنعتوں سے نکال کر ترقی یافتہ ممالک میں لے جاتے ہیں جہاں ان کی بہت کمائی ہوتی ہے۔ چائنہ پاکستان اکنامک کوریڈور (CPEC) اس تجارتی نظام کی پوری تقدیر بدل دے گا کیونکہ پاکستان میں اب تک کا بہترین انفراسٹرکچر تعمیر ہونے جا رہا ہے جو مختلف براعظموں کو سڑکوں کے ذریعے جوڑے گا اور خام مال کی نقل وحرکت زیادہ آرام دہ ہوگی۔ اس کے بدلے میں پوری دنیا کے تاجر یہاں سرمایہ کاری کی طرف راغب ہوں گے۔ توانائی کی قلت کا مسئلہ حل ہوگا کیونکہ بی بی سی نیوز کی رپورٹ کے مطابق توانائی کی قلت کے مسئلے پر قابو پانے کے لیے کوئلے، ہوا، شمسی اور ہائیڈروانرجی (Hydro-Energy) کے منصوبوں پر 15.5 ارب امریکی ڈالر کی سرمایہ کاری کی جائے گی۔ یہ پاکستان کے قومی توانائی کے شعبے میں 10,400 میگاواٹ توانائی کا اضافہ کرے گا۔

چین کو CPEC کی صورت میں سرمایہ کاری کی واپسی پر بہت سے تحفظات ہیں۔ CPEC کے ذریعے چین کو صرف پاکستان کی حدود سے گزرتے ہوئے براہ راست بحر ہند تک رسائی حاصل ہوگی۔چین کے پاکستان کے ساتھ شروع سے ہی انتہائی مستحکم تعلقات رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ چین پاکستان کے کم ترقی یافتہ علاقوں میں اتنی بڑی سرمایہ کاری کر رہا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اس بڑی سرمایہ کاری سے پاکستان کو بھی بہت سے فوائد حاصل ہوں گے۔چین پاکستان میں ملکی جی ڈی پی کا 20 فیصد سرمایہ کاری کرنے جا رہا ہے اور یہ 2008 سے اب تک پاکستان کو ملنے والی کل براہ راست سرمایہ کاری کا تین گنا ہے۔CPEC ون بیلٹ ون روٹ کا حصہ ہے جو سڑکوں کے ذریعے مختلف براعظموں کو جوڑنے کا منصوبہ ہے۔وزیر منصوبہ بندی احسن اقبال کے مطابق سی پیک صرف دو ممالک کا منصوبہ نہیں ہے بلکہ یہ اس سے بڑا منصوبہ ہے۔یہ منصوبہ دیگر تمام جنوبی ایشیائی اور علاقائی ریاستوں کو فائدہ دے گا۔

نتیجہ:۔ CPEC گیم چینجر ہے جو پاکستان اور چین کی پوری تقدیر بدل دے گا اور یہ جنوبی ایشیائی ممالک کو حیرت انگیز طور پر متاثر کرے گا۔پاکستان اور چین دونوں ممالک اسے آسانی سے مکمل کرنے کے لیے پرعزم ہیں۔لیکن جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ اس منصوبے کے ساتھ بہت سے مسائل اور بھی جڑے ہوئے ہیں۔دونوں حکومتوں کو اتنی رکاوٹوں کے باوجود اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مضبوط عزم کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔پاکستانی حکومت کو مختلف سیکورٹی، سیاسی، علاقائی اور صوبائی مسائل سے نمٹنے کے لیے کچھ مضبوط اقدامات کرنے ہوں گے۔حکومت پاکستان کو کسی بھی قیمت پر سیاسی اتفاق رائے حاصل کرنا ہوگا کیونکہ سیاسی تعاون ہی CPEC کی تکمیل کو یقینی بنا سکتا ہے۔دوسری جانب چینی حکومت کو بھی سنکیانگ (Xinjiang) کے نسلی گروہوں کو کنٹرول کرنے کے لیے کچھ اقدامات کرنے ہوں گے جو دہشت گردی کی سرگرمیوں میں بھی ملوث ہیں۔

مندرجہ بالا بحث کی بنیاد پر یہ کہا جاتا ہے کہ چین پاکستان اقتصادی راہداری ایک جامع منصوبہ ہے جس میں جنوبی ایشائی مرکز کے علاقائی روابط اور انضمام کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔ تاہم، ہندوستان کے نقطہ نظر سے، یہ منصوبہ چینیوں کی طرف سے علاقائی بالادستی کو قائم کرنے کی ایک اور کوشش ہے۔چائنا پاکستان اکنامک کوریڈور کی شکل میں چین اور پاکستان کے درمیان بڑھتا ہوا

تجویز اتی تعاون جنوبی ایشیا کی سرکردہ طاقت نئی دہلی کے لیے تشویش کا باعث ہے، جو اس منصوبے کے منصوبوں اور ارادوں کے بارے میں بظاہر ناراض ہے اور اس نے واضح طور پر اپنی مخالفت کا اظہار کیا ہے۔ یہ راہداری چین اور پاکستان دونوں کے لیے متعدد مقاصد کی تکمیل کرتی ہے اور یہ بشمول اقتصادی، سیاسی اور جیوسٹریٹیجک اہمیت بھی رکھتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھارت کے لیے سنگین خدشات کو اس لئے بھی جنم دیتی ہے۔ کہ پاکستان اور چین دونوں انڈیا کے لئے مخالفی پالیسیاں اپنانے کی چال چل رہے ہیں چاہے وہ سرحدی تنازعہ ہو یا دہشت گردی تنازعہ ہو اس خطرے کے پیش نظر بھارت کا رول ناگزیر ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

حواشی:۔

1. Yaseen, Z., Afridi, M. K., & Muzaffar, M. (2017) . Pakistan and China's Strategic Ties: Challenges and Opportunities in Trade Perspective. Global Regional Review, 2 (1) ,16-30.

2. Muzaffar, M., Yaseen, Z., & Rahim, N. (2017) . Changing dynamics of global politics: Transition from unipolar to multipolar world. Liberal Arts and Social Sciences International Journal (LASSIJ, 1 (1) , 49-61.

3. Afzal, N., & Muzaffar, M. M. M. (2020) . A China and India: On the Edge of Water Disputes and Co-operation. Journal of Arts & Social Sciences (JASS, 7 (2, 231-244.

4. Khetran, M. S. B., & Khalid, M. H. (2019) . The China-Pakistan Economic Corridor: Gateway to Central Asia. China Quarterly of International Strategic Studies, 05 (03) , 455-469. https://doi.org/10.1142/S2377740019500179.

5. Abid, M., & Ashfaq, A. (2015) . CPEC: Challenges and Opportunities for Pakistan. 16 (2) , 28.

6. Ali, G. (2017) . China-Pakistan Relations: A historical analysis. Ameena Saiyid, Oxford university Press, Karachi-74900.

7. Cherng-Shin, O. (2013) . The Sino-Pak trade and energy corridor: An assessment. Poland: Institute of International Relations, Warsaw Economic University.

8. Irshad, M. S., & Xin, Q. (2014). A new perspective of the China-ASEAN free trade area and the story of top ten products. European Journal of Business and Management, Forthcoming.

9. Nilofar, M., Jiang, W. S., & Ishtiaque, M. 2014. The growing economic ties between Pakistan and china and its impact on the economy of Pakistan. IMPACT: International Journal of Research in Humanities, Arts and Literature, 2 (12), 49-54.

10. Irshad, M. S., Xin, Q., & Arshad, H. (2015). One Belt and One Road: Does China-Pakistan Economic Corridor benefit for Pakistan's Economy? 8.

11. Butt, D. K. M., & Butt, A. A. (2015). IMPACT OF CPEC ON REGIONAL AND EXTRA - REGIONAL ACTORS. 22.

12. Kamran, M., & Mahsood, A. K. (2021). Dynamics of Indian Antagonist Approach towards CPEC and Its Implications for Pakistan. Mediterranean Journal of Social Sciences, 12 (1), 31.
https://doi.org/10.36941/mjss-2021-0003

13. Aqeel, M. (2016). Impact of China Pakistan economic corridor. Unpublished Degree Thesis, BBA International Business. ARCADA, 106.

14. Abid, M., & Ashfaq, A. (2015). CPEC: Challenges and opportunities for Pakistan. Journal of Pakistan Vision, 16 (2), 142-169.

15. Aqeel, M. (2016). Impact of China Pakistan economic corridor. Unpublished Degree Thesis, BBA International Business. ARCADA, 106.

عابد حسین ڈار
Research Scholar, department of Persian, University of Kashmir

سیمین دانشور کا نسائی شعور: ایک مطالعہ

(ناول ''ساربان سرگردان'' کے تناظر میں)

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
(اقبال)

تلخیص:

تحریک مشروطیت کے سبب فارسی ادب میں بہت سے نت نئے موضوعات ابھر کر سامنے آئے۔ انہی موضوعات میں نسوانیت ایک اہم موضوع ہوتا ہے، بہت سے خواتین قلمکار گزریں ہیں جنہوں نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ان میں رابعہ قزداری، سیمین بہبہانی، فروغ فرخزاد، پروین اعتصامی اور سیمین دانشور قابل ذکر ہیں، ان میں سے بعض قلم کار مغربی افکار و نظریات سے کافی متاثر رہی اور انہوں نے اپنی تخلیقات میں ایسے یکسو نظریات پیش کیے جو بالآخر تنازعات کا باعث بنتے ہیں، لیکن دانشور ایک ایسی باہوش تخلیق کار گزری ہے جو مغربی فمینیسم کو فحاشیت اور عریانیت اور ریڈیکل فمینیسم (Radical Feminism) سے تعبیر کرتی ہے۔

دانشور نے حقیقت پسندانہ انداز میں اپنے کرداروں کے ذریعے اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے، ان کے ہاں مرد و عورت کے حقوق قرآن کے ہاں متعین ہیں۔ وہ عورت کو ''شعر خدا'' مرکوز ''نثر خدا'' سے تعبیر کرتی ہے۔

کلیدی الفاظ: سیمین دانشور، فمینیزم، زن، ساربان سرگردان، سماجی، سیاسی، شعور۔

سیمین دانشور (۱۳۰۰/۱۳۰۹ش) جدید فارسی زبان و ادب کی ایک مشہور و معروف مصنفہ، داستان نویس، ناول نگار، معلّمہ اور ناقد گزری ہیں۔ فارسی کے ادبی دنیا میں ان کا شمار ایسے

اعلیٰ ترین تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی تحریروں سے ایک خاص روایتی جمود کو توڑنے کا ساماں فراہم کر کے اپنے موقلم سے معاشرہ کی عکاسی بخوبی انجام دی اس ضمن میں وہ ایک انٹرویوں میں اس معاشرتی خفکان و کسمپرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتی ہے:

''معاشرتی زنجیر کو توڑنے کی اجازت ہے۔ جب جلال سے ازدواج کیا تو اپنے خاندان سے جدا ہوئی ۔۔۔ میں نے غربت باپ کے داروخانے میں دیکھی اور جہالت اپنے اردگرد''

سیمین دانشور کے فکر وفن کا اہم موضوع فمینزم ہے۔ انہوں نے اپنے فکر وفن میں عورتوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا۔ وہ اپنے کرداروں کے درمیان زندگی اس خصوصیت ومشاہدے کی قوت کے ساتھ بسر کرتی ہے کہ ان کرداروں کے شخصی واقعات وحوادث، احساسات وعواطف اور افکار و نظریات ایک خاص پیرائے میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے مسحور کنندہ اسلوب بیان جو سادگی و سلاست، اثر خیزی واثر انگیزی کے اوصاف کا حامل رہا ہے سے انسانی زندگی کے نشیب وفراز اور اسرار و رموز کی نقاب کشائی بڑی مہارت اور چابکدستی کے ساتھ انجام دیتی ہے۔

اس حوالے سے ان کی داستانیں اور ناول اپنے معاشرے کی عکاسی کرنے کے حوالے سے ایک مرقعے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سیمین دانشور اپنے ماحول کو اپنی تخلیقات میں خالی مدغم یا مرتسم نہیں کرتی ہے بلکہ وہ اس ماحول میں نشو ونما پا کر اس کے افکار و خیالات، مزاج ولطائف اور حالات واقعات کا خود بخود ایک صاف وشفاف آئینہ بن جاتی ہیں۔ جب کوئی باحس فنکار اپنی تحریر میں انسانی معاشرے کے بارے میں قلم اٹھاتا ہے تو پورا معاشرہ اپنے جذبات، عادات ورسومات اور روایات وفلسفہ جہان بینی اس کے قلم سے منصۂ شہود پر جلوہ افگن ہوتا ہیں۔ سیمین دانشور انہی خصائص وصفات کے ساتھ اپنے تخلیقی فن پاروں کو فارسی ادب کے کینوس میں پیوستہ کرتے ہوئے دکھائی دیتی ہیں۔

سیمین دانشور نے فارسی کے فکشن میں موضوعی اور معروضی سطح پر ایک نیا طرز وروش ایجاد کی، جس میں جاگیردارانہ نظام کا عورتوں پر استحصال ایک نمایاں انداز میں قاری کے سامنے اپنی موجودیت کا ثبوت فراہم کر رہا ہے۔ یہ ایک واضح امر ہے کہ عورتوں کے گوناگوں مسائل کے بارے میں اظہار خیال کرنا

ایک مرد اساس معاشرے میں مشکل امر ہے۔اس کے لئے جرائت ،عزم واستقلال اور صلابت فکر کے ساتھ ساتھ وسیع مطالعہ اور تلاش وجستجو کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔مرد اساس معاشرے کی واقعیت کو ہم اس حقیقت سے سمجھ سکتے ہیں کہ سیمین نے جو مقالات ،انٹرویز اور کالم ریڈیو تہران کے لئے لکھے اس میں انہوں نے ''شیرازی بی نام'' کا نام ٹھیک اسی طرح اختیار کیا جیسے برطانیہ کی معروف ناول نگار ''مری ان اونز'' نے اپنی تحریروں میں مردانہ نام ''جورج الیوت'' اختیار کیا تھا۔

فارسی کے ادبی دنیا میں ایسے بہت سے تخلیق کار و مفکرین گزرے ہیں جنہوں نے وجود و حقوق زن کے متعلق خامہ فرسائی کرنے کی کوشش کی ہے۔اس ضمن میں تاریخی طور پر جو سب سے برجستہ نام ہے وہ پروین اعتصامی کا ہیں۔وہ نسوانی وجود اور لطائف کے حوالے سے یوں فرماتی ہیں:

در آن سرای که زن نیست ،انس و شفقت نیست
در آن وجود که دل مرده،مرده است روان
به هیچ مکتب و دیباچه یی قضا ننوشت
برای مرد کمال و برای زن نقصان
زن از نخست بود رکن خانه هستی
که ساخت خانه بی پایه بست و بی بنیان
زن از براه متاعت نمی گداخت چو شمع
نمی شناخت کس این راه تیره را پایان
فرشته بودن زن ،آن ساعتی که چهره نمود
فرشته بین، که برو طعنه میزند شیطان
اگر فلاطون و سقراط ،بوده اند بزرگ
بزرگ بوده پرستار خردی ایشان
چوناخداست خرد مند و کشتیش محکم
دگر چه باك زامواج و ورطه و طوفان (۱)

سیمین دانشور کے آثاروں میں ''آتش خاموش(۱۳۲۷)،جزیرہ سرگردان(۱۳۸۰)،ساربان

سرگردان (۱۳۸۰) جلد دوم جزیرہ سرگردان، بہ کی سلام بکنم (۱۳۵۹) سووشون (۱۳۴۸) میں نسوانیت کے موضوع پر مفصل بحث ہوئی ہے۔ان کی یہ تحریریں اس بات کی آئینہ دار ہیں کہ انہوں نے عورتوں کو وجودی وانسانی حیثیت سے دیکھا ہے۔اپنی داستانوں اور ناولوں میں سیمین دانشور نے ایک خاص قسم کے اسلوب وآہنگ کو اپنا کر معاشرے کی روایتی اخلاقیات کی دھجیاں یوں بکھیریں کہ ادبی وغیر ادبی حلقوں میں کہرام سا مچ گیا۔

دانشور اس بات کی قائل تھی کہ ایرانی معاشرے پر غرب زدگی کا بوت سوار ہے اور اس بت کو کچلنا ان کا خاص مقصد ٹھہرا، جیسا کہ یہ نکتہ اظہر من الشمس ہے کہ دانشور کا دور سماجی اور ادبی انقلاب کا پرشور دور تھا اس دور میں ادبی تحریکیں وجود میں آئیں جن میں تحریک مشروطیت قابل ذکر ہیں۔اس تحریک کے خاص اراکین میں ان کا شمار ہونے کے علاوہ دانشور کے دل و دماغ پر اس نے گہرا اثر ڈالا۔ابتدا میں دانشور تحریک مشروطیت کے مصنفین کے طرز فکر اور روایتی طبقاتی شعور کی بنیادوں پر اپنے تخلیقی اظہار کو اختیار کرتی ہوئی نظر آتی ہے مگر بہت جلد ان کا نسائی شعور مشروطیت کے موضوعاتی کینوس و سخت گیری سے آگے بڑھ جاتا ہے یوں اپنی ادبی تحریروں میں ایک ایسے معاشرے سے روشناس ہوتی ہے اور قاری کو روشناس ایسی دنیا سے کرواتی ہے جہاں عورت و مرد کو طبقاتی نابرابری، زن سالاری، مرد سالاری، استحصال اور غرب زدگی کے عناصر سے پالا پڑتا ہیں۔یہی وجہ ہے کہ دانشور کی داستانوں اور ناولوں کے پس منظر میں مذکورہ بالا مسائل کے تنوع کی جھلک ملتی ہے۔کہیں جاگیردارنہ نظام میں ان کے کردار بغاوت کرتے نظر آتے ہیں تو کہیں ماڈرن لڑکیاں سڑکوں پر بے حجاب گھومتی ہوئی نظر آتی ہیں، ان کی نظر میں ایسی بے شعور لڑکیاں فحاشیت کو نسوانی آزادی کا عنوان دیتی ہیں۔اس سلسلے میں دانشور ایسی عورتوں کو ایک خوب صورت انداز میں کچھ اس طرح نصیحت کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں:

"سلیم من یك معنا فمینیست هستم،همین طور که هستم مرا می خواهی؟ گفت با تمام وجودمی خواهمت۔اما فمینیسم انواع و اقسام دارد۔فمینسیم غربی در آخرین تحلیل حق مرد می گیرد و به زنان می دهد و به همین علت این همه طلاق در غرب رواج دارد۔چرا که طرفین معادله بهم خورده است۔مرد مظلوم و زن ظالم شده است۔گفت:قریب شش

ملیون مرد غربی خود را گم گور کرده اندتا اموالشان را با زنهای مطلقه شان نصف نکنند" (۲)

یہ امر واضح ہے کہ دانشور نے ایرانی عورت کو سماجی، سیاسی، معاشی اور نفسیاتی شعور کے حوالے سے ایک وسیع منظر نامے میں دیکھنے کی کوشش کی ہے، اس سلسلے میں وہ اسلام کے تصور نسائیت سے مدد لیتے ہوئے مرد اور عورت کے مابین حقوق و تعلقات کو اجاگر کرتی ہے۔ مغربی دنیا کی جنسی ناہنجاری، فحاشیت اور اخلاقی تنزل کو اجاگر کرنے کے بعد دانشور نے مشرقی نظریہ نسوانیت کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے وہ قرآن کے پیش کردہ منفرد تصور حقوق مرد و زن کے متعلق اشارہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"از فمینیسم شرقی گفت: گفت در شرق بایستی حقوق زن را بالا ببریم تاهم سطح مرد بشود۔۔۔حدود همه حقوق زن و مرد در قران کریم تعین شده است۔نمی شود که ضد قران فتوی داد و عمل کرد" (۳)

دانشور اپنی ادبی تحریروں میں اس اہم نکتے کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ معاشرہ کبھی بھی غیر جنسی نہیں ہوسکتا اور جہاں کہیں اس منافقت کو یوں روا رکھا جاتا ہے کہ عورت کی جنسی ضروریات اور جنسی شناخت کو مسخ ہو وہاں عورت اپنے فطری پوشیدہ قویٰ سے اپنے جنسی غریزے (Sexuality) کے اثبات کے لیے راہیں تلاش کرتی رہتی ہیں۔ جہاں انہوں نے عورتوں کے مجموعی حقوق کی بات کی ہے وہیں اس کے ساتھ ساتھ ان کی جنسی و نفسیاتی خلش سے بھی انہوں نے سروکار رکھا ہے وہ اس طرح کہ ان کے ہاں جنس کی فطری جبلت عورت ذات کے شخصی ارتقاع کا اثر گزار جوہر بن جاتا ہے، اس ضمن میں ان کی مشہور داستانوں میں ''آتش خاموش'' اور ''ساربان سرگردان'' قابل ذکر رہتے ہیں۔

جب ان کے آثار کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو مختلف داستانوں میں مختلف طرح کی عورتوں کی روئداد بیان ہوئی ہے، ان کے ہاں غمزدہ، ستم دیدہ عورت بھی ہے اور شجاع اور خود پرست بھی، مفلوک الحال، بیوہ اور ظالم و بدذات بھی۔ الغرض انہوں نے اپنے کرداروں کے ذریعے ایسی عورتوں کو پیش کیا جو انسانی معاشرے میں ہر سوں دکھائی دیتی ہے۔ ان کی نظر میں ایک عورت اپنے حقوق کی بازیابی اور اظہار ذات کے حوالے سے کبھی سکوت کو ترجیح دیتی ہے اور کبھی بہادری کا مظاہرہ کرتی ہے۔ وہ بہادری، حقوق اور آزادی

اپنے کرداروں 'ہستی' 'فرخندہ' اور 'سلیم' کے ذریعہ اجاگر کرتے ہوئے نظر آتی ہے:

"هستی چادر در دست به اتاق فرخنده رفت-فرخنده داشت ورزش می کرد-

هستی پرسید:فرخنده تو سلیم فرخی را می شناسی؟

خیلی خوب-حتی مدتی عاشقش بودم،دیدم بی فایده است رها کردم-

چه جور آدمی است؟

مرموز و تاحدی ترسو-اما مسلمان واقعی و بسیار دانا-مردسالار و پدر سالار هم هست-

فرخنده راست می گوید:سلیم مرد سالار است -آن روز در پارك مر متقاعد کرد که دست از شغلم بردارم-من از استقلال مالی حرف زدم-پرسید چه استقلالی؟ گفت احتیاجی پول آن شغل که ندارم -من از تساوی زن و مرد حرف زدم و در اجتماع بودن"- (۴)

مجموعی طور پر سیمین دانشور کے منفرد نسائی شعور نے فارسی ادب میں ایک نئے اور قابل ستائش باب کا اضافہ کیا۔اس حوالے سے وہ مغربی نظریہ زن سے کافی زیادہ متفرد نظر آتی ہے اور ایرانی عورتوں کو قدیم باستانی و ایرانی تصور زن کے حوالے سے متنبہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے ۔وہ مغربی فمینزم کو فحاشیت اور عریانیت سے تعبیر کرتی ہے۔

دانشور نے جس انداز میں حقوق زن،شخصیت زن،سماجی نظام،معاشی آزادی اور نسائی شعور کے لئے آواز بلند کی وہ قابل تحسین ہے،معاشی آزادی،نسائی شعور،تقدس زن اور شخصیت زن کے سلسلے میں وہ ایک توانا و پرشور آواز رہی ہے۔ایک عورت ہونے کے ناطے جس طرح انہوں نے ''عورت'' کو موضوع سخن بنایا اور ان کے مسائل کی ترجمانی و نمائندگی کر کے اپنی تخلیقی قوت سے ایسے زندہ و جاوید کردار پیش کیے جو ان کے فکر و فن کے شہکار نمونوں میں مبدل ہوتے ہیں۔

منابع و مآخذ:

۱۔پروین اعتصامی،فرشته انس، gonjoor.net/parvin/divanp/mtm/sh102۔
۲۔دانشور ،سیمین،ساربان سرگردان،انتشارات خوارزمی، تهران،۱۳۸۰، ص۸۲
۳۔همان،ص ۸۲۔
۴۔دانشور ،سیمین،ساربان سرگردان،انتشارات خوارزمی،تهران،۱۳۸۰،ص،۸۱،۸۲۔
۵۔دانشور ،سیمین،آتش خاموش،انتشارات کتابز،تهران،۱۳۲۷۔
۶۔دانشور ،سیمین،به کی سلام بکنم،انتشارات خوارزمی،تهران،۱۳۸۰۔

آصف علی احمد
Research Scholar, Department of Persian, University of Kashmir

معاصر فارسی ادب کے آبشار: ایک تجزیاتی جائزہ

''معاصر فارسی ادب کے آبشار'' ڈاکٹر محمد افروز عالم کی محنتوں کا ثمرہ ہے جس میں استاد نے ایک ایرانی پروفیسر ڈاکٹر محمد جعفر یاحقی کی کتاب ''جوئبار لحظه ها'' کا ترجمہ نہایت ہی دلکش انداز اور سادہ انداز میں کیا ہے۔ یہ کتاب جدید فارسی ادب کی تاریخ کا ایک اہم اور قیمتی خزانہ ہے جو ڈاکٹر یاحقی صاحب کی کاوشوں کا نتیجہ ہے جس کو انھوں نے فارسی زبان وادب سے وابستہ اساتید، محققین اور دیگر طلباء کے علم و ادب میں اضافہ کے لیے تالیف کر کے منظر عام پر لایا ہے۔ لیکن یہ کتاب اتنی مشکل عبارت اور طویل جملات میں لکھی گئی ہے کہ ایران سے باہر کے فارسی ادب سے وابستہ طلباء کی فہم وادراک سے بالاتر ہے کیونکہ اس کی عبارت نہایت دقیق انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس لیے اس کتاب کے ترجمے کی ضرورت لاحق ہوئی اور بیشتر طلباء اور دیگر ایرانی ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے بارہا اصرار پر کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ فارسی سے وابستہ ایک استاد ڈاکٹر محمد افروز عالم نے جہان فارسی ادب میں ایک درخشندہ ستارے کی مانند نمودار ہو کر اس دقیق ودشوار عبارت کو اپنی زندگی کے قیمتی تین سال صرف کر کے اس کتاب کا ترجمہ ''معاصر فارسی ادب کے آبشار'' کے نام سے عرشیہ پبلیکیشنز دہلی سے شائع کروا کر تشنگان ادب کی پیاس بجھانے کی بے پایان کوشش کی ہے۔

جیسا کہ استاد محترم نے کتاب کے مقدمے میں خود لکھا ہے کہ کتاب کے ترجمے کے لیے مؤلف سے اجازت لینی پڑی تو ایران کلچر ہاوس نئی دہلی میں مرکز تحقیقات فارسی کے رئیس جناب احسان اللہ شکر اللہ کے ذریعہ مؤلف سے ٹیلی فون پر رابطہ کر کے اجازت طلب کی۔ اس کے بات استاد محترم نے اپنی مساعی جمیلہ سے اس عظیم کام کو انجام دے کر فارسی ادب کی خدمات میں اضافہ کیا، جس کے اجراء کی رسم شعبہ فارسی، کشمیر یونیورسٹی میں دیگر شعبہ جات کے اساتید اور دانشگاہ کشمیر کی دیگر برجستہ شخصیات کی موجودگی میں ادا کی گئی۔

کتاب ''معاصر فارسی ادب کے آبشار'' نہایت ہی سادہ اور اور عام فہم زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے جس میں عصری بیداری سے لے کر کتاب کی تالیف تک کے باحیات قلمکاروں، ادیبوں اور جدید دور کے شعراء اور فارسی ادب کی پیش رفت میں رونما تبدیلیوں اور ایران میں یورپی تمدن وتہذیب کے قیام اور ہر قسم کی دیگر جدیدیت کا ذکر نہایت ہی مفصل انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔

یہ کتاب سات مختلف ابواب پر مشتمل ہے کتاب کا پہلا باب بیداری کے بعد کا ادب، دورہ بیداری کے اشعار کی خصوصیات و ماہیت، مظفر الدین شاہ قاچار کا مشروطیت کے فرمان دستخط ایران اور روس کے معائدے ترکمن چاے اور گلستان کے نقصانات، عصر بیداری کے شعراء، اس دور کے اشعار کی ماہیت، اس دور کے روز ناموں اور اس دور کے کچھ نامور شعراء جیسے فرخی یزدی شاعر نستودہ، لاہوتی شاعر آوارہ از وطن وغیرہ جیسے مضامین کا ذکر کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں نیما یوشیج کے دور اشعار یعنی اشعار میں تبدیلی کا دور ہے، شعر نیمائی کی تاریخی دورہ بندی، تقی رفعت کی پیش قدمی، افسانہ کب اور کیسے، نیما کی نظر میں تبدیلی کا مفہوم، عصر نیمائی کے دوسرے دور کا ادبی جریان، احمد شاملو اور شعر منثور، ملتزم ادبیات، مقاومتی ادبیات، دورہ بیداری کے سیاسی و سماجی روز ناموں اور جرائد اور دیگر برجستہ شعراء بہار مشہدی، فروغ فرخ زاد، شمس کسمائی، گلستان فریدون توللّی اور پروین اعتصامی وغیرہ کے احوال وآثار کو فارسی نمونوں کے پیش نظر مفصل بحث کی گئی ہے۔

تیسرے باب میں عصر انقلاب کی ادب اور اشعار کی خصوصیات درج ہیں۔ چوتھے باب میں معاصر داستانی ادب، ترجمہ اور فارسی سادہ نویسی میں اس کی اہمیت، ناول نویسی کا آغاز، داستان نویسی اور اس کا آغاز، داستان کوتاہ اور ناول میں فرق، ایران میں بچوں کے نئے ادب پر سرسری نظر، عصر انقلاب کے داستانی ادب اور اس کے بعد مختلف قلمکار، ادیب اور شعراء جیسے جمالزادہ، صادق ہدایت، صادق چوبک، م۔ بہ۔ آذین، جلال آل احمد، سیمین دانشور، غلام حسین ساعدی، محمود دولت آبادی، گوہر مراد، احمد محمود، ھوشنگ گلشیری وغیرہ اور بعض دوسری تخلیقات جو یورپی زبانوں میں تصنیف ہوئیں ان کے فارسی میں ترجمے آسان زبان میں ہوئے، اس طرح اس کتاب میں دور جدید کے تمام موضوعات کے الگ الگ بیان کیا ہے۔

پانچویں باب میں مقالہ نگاری اور دانشگاہی فارسی، متنوں کی تصحیح اور لفظ شناسی، سرہ نویسی اور

پاک زبان، فارسی وعربی رسم الخط اوراس کی تبدیلی اوران مندرج عنوان کے تحت قلمکاروں کے احوال اور ان کے تخلیقی کارنامے اوران کی اہمیت کو بیان کیا ہے اس باب میں تمام رسائل، روزناموں ہفت ناموں، ماہناموں اور دیگر اخبارات جو ایران کی سیاسی اور سماجی بیداری کے لیے ایرانی دانشگاہوں سے چھپتے تھے اور زبان وادب کی پیش رفت کے لیے مقالاجات لکھے جاتے تھے، مؤلف نے تمام دیگر مضامین میں ایران کی سیاسی بیداری کی تحریک اور ایرانی جدیدیت جیسے عنوانات کو بیان کیا ہے۔

چھٹے باب ایران معاصر میں عورتوں کے ادب اور ان کا مردوں کے مدمقابل ادب کے میدان میں کھڑے ہوکر جواب دینا اور مردوں کی جانب سے عورتوں پر لگائے گئے الزامات کے جواب میں مردوں کی آثار کے جواب میں اپنی تخلیق جیسے معائب الرجال لکھ کر اپنا کردار ظاہر کرنا اور اپنی فعالیت کو مردوں کے سامنے تیز کرنا اور اس بات کو واضح کرنا کہ عورتیں مردوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کی طاقت رکھتی ہیں، اور اس کے علاوہ اس باب میں عورتوں کے میدان میں آنے کے اسباب کو بیان کر کے ایران کی چند برجستہ ترین عورت شاعروں جیسے پروین اعتصامی، خانم فروغ فرخزاد، صفیہ گلرخسار وغیرہ کی معاشرے سے باہر نکل کر ادبی میدان میں اپنی فعالیت کو تیز کر کے سماج کی عورتوں کو ترقی کی راہ پر لانے کی سعی کرنا وغیرہ قابل ڈکر ہے۔ اس طرح یہ باب عورتوں کے ادب پر لکھا گیا ہے۔

ساتواں باب ان تمام ابواب سے منفرد ہے کیونکہ اس باب میں مؤلف نے ایران سے خارج دیگر ممالک کے فارسی ادب کی فعالیت کو بیان کیا ہے اور فارسی ادب کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ اس کی تبدیلی اور پیش رفت اور چند دوسرے برجستہ شخصیات، ادباء وشعراء جیسے محمد شفعی رہگذر صدرالدین تاجیکی ادب کے بنیادگزار، ابوالقاسم لاہوتی، جلال الدین اکرامی، رحیم جلیل، فاتح نیازی، میر سعید میر شکر، میرزا تورسون زادہ، صابر بازار، لائق شیر علی اور صفیہ گلرخسار وغیرہ جنہوں نے فارسی زبان وادب میں نہایت ہی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب ایران کے جدید ادب میں کافی اہمیت کی حامل ہے اور فارسی زبان وادب کے طالب علموں کے لیے نہایت ہی مفید ہے۔

''معاصر فارسی ادب کے آبشار'' جدید ایرانی ادب میں کی نہایت ہی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اس میں مولف نے ایران میں انقلاب اسلامی کی تحریک اور بیداری سے بعد کے تمام جدید ادب سے وابستہ تمام موضوعات کو زیر بحث لایا ہے۔ میری نظر میں اس سے پہلے کوئی بھی کتاب اس سبیل کی جو اپنے

اندر تمام جدید وقائع اور موضوعات اپنے اندر سموئے ہوئے ہو نہیں گزری۔ دورہ بیداری کے بعد سے لے کر کتاب کی طباعت تک تمام قلمکاروں، داستان نویسوں، ناول نویسوں، ڈرامہ نگاروں اور شعر نیمایی کے نمائندہ شاعروں اور اس طرز کے تمام شعراء جنہوں نے کلاسیکی روش کو ترک کر کے شعر نو کے میدان میں قدم رکھا، تمام کے احوال و منثور و منظوم تخلیقات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ فارسی ادب کی تبدیلیوں کے اسباب، قدیم کلاسیکی ادب کی قید و بند سے باہر نکل کر اپنے تخیلات و نظریات کو منظر عام پر لانے کی کاوشوں اور داستانوں اور دیگر تخلیقات کے موضوعات کو بیان کیا ہے تا کہ قارئین کی دلچسپی میں اضافہ ہو۔

''معاصر فارسی ادب کے آبشار'' کے محاسن و معایب:

مترجم ڈاکٹر محمد افروز عالم دانشگاہ کشمیر میں شعبہ فارسی میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں، آپ نے اس عظیم کام کو اپنی مصروفیت کے باوجود پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی ہے اللہ تبارک و تعالیٰ مترجم ڈاکٹر محمد افروز عالم کے علم میں بے پایاں ترقی عطا فرمائے تا کہ فارسی ادب کے طلباء کی آسانی کے لیے اس طرح کے عظیم کام انجام دیتے رہیں۔ استاد محترم نے کتاب ''جوئبار لحظه ها ''جو نہایت مشکل عبارت میں لکھی گئی ہے اس کو اردو زبان میں ''معاصر فارسی ادب کے آبشار'' کے نام ترجمہ کر کے مشکلات کو آسان کر دیا۔

محاسن:

۱۔ مترجم نے کتاب ''معاصر فارسی ادب کے آبشار'' کو نہایت عام فہم اور عمومی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

۲۔ مترجم نے اصل کتاب میں مندرج شمسی و قمری تواریخ کے علاوہ عیسوی تواریخ کا اضافہ کیا ہے۔

۳۔ اصل فارسی کتاب میں مندرج غیر ایرانی فارسی قلمکاروں کے فارسی ناموں کے ساتھ انگریزی ناموں کا بھی اضافہ کیا ہے۔

۴۔ معاصر فارسی ادب میں مندرج فارسی، اردو اور انگریزی نمونوں کو الگ الگ اسٹائل میں تحریر کیا ہے تا کہ ہر زبان میں تفاوت برقرار رہے۔

۵۔ مترجم نے کتاب کا نام بھی نہایت دلچسپ منتخب کیا ہے۔

۶۔ کتاب ''معاصر فارسی ادب کے آبشار'' کی جلد اور صفحات بھی عمدہ ہیں جو قارئین کی دلچسپی میں خاطر خواہ اضافہ کرتے ہیں۔

۷۔''معاصر فارسی ادب کے آبشار'' میں اردو ترجمہ شعراء کے منثور اور منظوم نمونوں کو فارسی میں رکھا گیا ہے۔

۸۔ یو۔جی۔سی۔ کے امتحان جیسے نیٹ، سیٹ اور جے۔آر۔ایف کے لیے بہت اہم کتاب ہے۔

۹۔ مترجم نے اصلی کتاب سے کوئی بھی عبارت حذف نہیں کی اور اصلی کتاب میں مندرج کتابیات اور فوٹ وغیرہ کو اصلی حالت میں اپنے ترجمہ یعنی معاصر فارسی ادب کے آبشار میں درج کیا ہے اور ان میں کوئی بھی تبدیلی نہیں لائی۔

معائب:

ا۔معاصر فارسی ادب کے آبشار میں کہیں کہیں ٹائپنگ میں غلطی رہ گئی ہیں۔

مشورہ:

مترجم سے مودبانہ درخواست ہے کہ وہ دوسری ایڈیشن میں ان تمام غلطیوں کو جو ٹائپنگ میں رہ گئی ہیں درست کر کے چھپوائیں۔

المختصر یہ کتاب فارسی ادب کے تمام اسکالرز اور اساتید کے لیے نہایت سودمند ہے کیونکہ جدید فارسی ادب کے لحاظ سے اردو زبان میں کوئی کتاب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے۔اس کے علاوہ جدید ایرانی ادب سے وابستہ یو۔جی۔سی نصاب کی تکمیل کے لیے نہایت ہی کارگر ثابت ہو سکتی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر فیاض عالم
Urdu Scholar, Shaheen Bagh, New Delhi

پریم چند کا افسانہ 'کفن': انسانیت کی شکست وریخت کی روداد

کفن نہ صرف پریم چند بلکہ اردو ادب کا شاہکار افسانہ ہے جسے پریم چند نے دہلی قیام کے دوران ڈاکٹر ذاکر حسین کی فرمائش پر لکھا جو پہلی بار رسالہ جامعہ میں 1935 کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس افسانے میں غریبی، بے روزگاری، فاقہ کشی، مہاجنی مظالم زمینداروں کے ظلم وستم اور انسانی رشتوں کی شکست وریخت جیسے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

بدھیا اس افسانے کا مرکزی کردار ہے جو پورے افسانے میں چیخنے اور کراہنے کے علاوہ کوئی دوسری آواز نہیں نکالتی لیکن باوجود اس کے وہ پورے افسانے پر اپنا اثر رکھتی ہے۔ بدھیا کا یہ کردار افسانے کا ایسا کردار ہے جو اپنی انفرادیت کے ساتھ گھیسو اور مادھو دونوں کے رویوں کو بیان کرتا ہے۔ پریم چند کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے بدھیا کے دردزہ اور پھر اس کی وجہ سے اس کی اور اس کے ہونے والے بچے کی موت سے پوری کہانی کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ بدھیا ایک سال قبل مادھو کی زندگی میں آتی ہے۔ اس کے آنے کے بعد اس گھر میں تمدن آتا ہے وہ گھاس چھیلتی ہے اور اس کو بازار میں بیچ کر اپنے سسر گھیسو اور شوہر مادھو کا پیٹ بھرتی ہے۔

ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں؛

> ''زندگی کی عام منطق اور اخلاقیات کے مروج اصول وضوابط کے برخلاف ہم یہاں دیکھتے ہیں کہ وہ عورت جو دوسرے افراد خانہ کی زندگی کے لیے معاون اور ان کی تن پروری کے لیے آلہ کار اور معاشی مسائل کو آسان بنانے کا ذریعہ بن کر نمودار ہوئی ہے اسی عورت کے ساتھ جب ان افراد کے برتاؤ اور انسانی اور اخلاقی رشتوں کی شکست کے مظاہر سامنے آتے ہیں تو اخلاقیات کے سارے اصول ہمیں پاش پاش ہوتے

نظر آتے ہیں۔ یہاں رشتوں کی شکست وریخت اور مروت و ہمدردی کے فقدان کا واحد سبب اپنے وجود کی بقا اور تحفظ کی وہ لرزہ خیز خود غرضی ہے جو ان دونوں کو غیر ذات کی کسی بھی اذیت اور بحران سے چشم پوشی پر مجبور کرتی ہے۔ گھیسو اور مادھو کا غیر انسانی برتاؤ ایک لمحے کے لیے ہمیں جھنجھوڑتا اور چونکاتا ہے مگر حیرت کی کیفیت دوسرے ہی لمحے اس جملے پر آ کر اپنی شدت کم کر دیتی ہے جب ہم سنتے ہیں کہ ''مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا۔'' یہاں بنیادی مسئلہ وہ آلو ہیں جنہیں بھون بھون کر دونوں اپنی بھوک مٹا رہے ہیں۔''(۱)

بدھیا جب بیمار ہوتی ہے تو گھیسو اور مادھو کو اس کی زندگی سے زیادہ چوری کیے ہوئے آلو کے ذریعہ اپنا پیٹ بھرنا زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ بھیشم ساہنی نے لکھا ہے کہ غریب کی دنیا میں سب کچھ ثانوی ہے، درد زہ سے چلانے اور آخر میں دم توڑ جانے والی بیوی ثانوی ہے۔ باپ بیٹا اور شوہر بیوی کا رشتہ بھی ثانوی ہے۔ بھنے ہوئے دو آلو بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہاں یہ دونوں تمام اخلاقیات کو بالائے طاق پر رکھ کر بدھیا کو پریشانی کے عالم میں مرنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں کتنے افسوس کی بات ہے کہ شوہر بیوی کا رشتہ جسے سب سے پاک اور اٹوٹ مانا جاتا ہے وہ بھی بھنے ہوئے آلو کے آگے بے معنی ثابت ہوتے ہیں۔ مصنف نے ان کی اس بے حسی کی وجہ سے ہی انھیں بے غیرت قرار دیا ہے ان دونوں میں نہ تو عزت نفس باقی ہے اور نہ ہی رشتے کو سمجھنے اور نبھانے کا جذبہ پیٹ کی آگ کو بجھانے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں جس کی وضاحت اس اقتباس سے ہو جاتی ہے۔

''جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹے دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی جوان بیوی بدھیا درد زہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی اور رو رو کر اس کے منہ سے ایسی دل خراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔

جاڑوں کی رات تھی، فضا سناٹے میں غرق سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔

گھیسو نے کہا معلوم ہوتا ہے بچے کی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا۔ جا دیکھ تو آ۔

مادھو درد ناک لہجے میں بولا۔ مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا آؤں؟

تو بڑا بے درد ہے بے! سال بھر جس کے ساتھ زندگانی کا سکھ بھوگا اسی کے ساتھ بے وپھائی۔''(۲)

اس اقتباس سے دونوں کی ذہنیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے یہ دونوں نہ صرف اپنے کنبہ بلکہ گاؤں والوں کے بھی مجرم ہیں۔ایک طرف باپ بیٹے دونوں گھر کی بہو کو مرنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں اس طرح وہ غیر انسانی سلوک کے لیے مجرم ہیں وہیں دوسری طرف وہ گاؤں والوں کے مجرم اس لیے ہیں کہ بدھیا کی موت کے کفن کے لیے اکٹھا کیے گے پیسے کا غلط استعمال کرتے ہیں بدھیا کی موت پر یہ دونوں رونے کا ڈرامہ کرتے ہیں اور گاؤں سے بدھیا کی کفن کے لیے چندہ اکٹھا تو کرتے ہیں لیکن کفن نہیں خریدتے ہیں۔کفن کے لیے پانچ روپیہ ان کے ہاتھ میں جیسے ہی آتا ہے ان کی ذہنی کیفیت بدلنے لگتی ہے اور سستا اور مہنگا کفن پر تبادلہ خیال شروع کر دیتے ہیں اور پھر کفن کی ضرورت پر ہی سوال اٹھانے لگتے ہیں۔

''بازار میں پہنچ کر گھیسو بولا۔لکڑی تو اسے جلانے بھر کو مل گئی ہے، کیوں مادھو''

مادھو بولا''ہاں لکڑی تو بہت ہے اب کپھن چاہیے!

''تو کوئی ہلکا سا کپھن لے لیں۔

''ہاں اور کیا لاش اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی رات کو کپھن کون دیکھتا ہے۔

''کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھاکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اس کے مرنے پر نیا کپھن چاہیے۔

''کپھن لاش کے ساتھ جل تو جاتا ہے''۔(۳)

اس اقتباس سے ہے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کے نزدیک پیسے کی اہمیت زیادہ ہے۔گھیسو اور مادھو جیسے کردار معاشرے کو سمجھنے کا موقع دیتے ہیں پریم چند نے جس سماج کو دیکھا تھا اور آج ہم جس سماج میں رہ رہے ہیں اس میں کتنا فرق ہے اس کی خوبصورت تصویر اس افسانے میں دیکھنے کو ملتی ہے۔اس افسانے میں ہمارے سماجی اور مذہبی نظام پر بھی طنز کیا گیا ہے جس میں انسان کی قدر اس کے جیتے جی تو نہیں کی جاتی لیکن اس کے مرنے کے بعد مختلف رسوم ورواج پر لاکھوں روپیے خرچ کر دیے جاتے ہیں۔یہاں مصنف نے زندگی اور موت سے متعلق مختلف رویوں کے علاوہ زندہ افراد سے نفرت اور مردہ پرستی میں برابر کے شریک ہونے والے سماج کے نام نہاد باعزت لوگوں کے کردار کو اجاگر کیا ہے۔یہاں نہ صرف مادھو بلکہ یہ افسانہ خود ایک سوال قائم کرتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں زندگی کی اہمیت موت سے کم کیوں ہے۔ہمارے رسم ورواج اور اصول

زندگی پر موت کو کیوں ترجیح دیتے ہیں۔اس افسانے میں گھیسو اور مادھو بدھیا کی موت کے بعد ہی اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش کی تکمیل کر سکے ہیں۔اچھا اور پیٹ بھر کے کھانا ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے جس کی تکمیل بدھیا کی موت کے بعد ہوتی ہے۔

''بڑی اچھی تھی بیچاری۔مری بھی تو خوب کھلا پلا کر۔

آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہوگئی گھیسو نے دوسیر پوڑیاں منگوائیں۔گوشت اور سالن اور چٹ پٹ کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں شراب خانے کے سامنے ہی دکان تھی۔ مادھو لپک کر دو پتلوں میں ساری چیزیں لے آیا۔پورے ڈیڑھ روپے خرچ ہو گئے۔صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے تھے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے پوریاں کھا رہے تھے۔جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو۔نہ جواب دہی کا خوف تھا نہ بدنامی کی فکر''۔(۴)

گھیسو اور مادھو شراب خانے میں آنے کے بعد موت کا مرثیہ نہیں پڑھتے بلکہ زندگی کی نئی ساز چھیڑتے ہیں جس میں زندگی کی وہ خواہشات ہوتی ہیں جن کو آج پورا کرنے کا موقع ملا ہے۔یہاں بدھیا ان دونوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ انھیں زندگی میں پہلی بار جو شراب اور لذیذ کھانا میسر ہوتا ہے وہ بدھیا کی موت کے بدولت ہی ہو پاتا ہے۔

سوامی وویکانند نے کہا تھا جنت کا راستہ جہنم سے ہو کر جاتا ہے۔گھیسو اور مادھو ایسے ہی جہنمی راستے پر چل کر اپنی زندگی کے سب سے اہم اور دیرینہ خواہش کو پوری کرتے ہیں۔اناج کی کمی اور کھانے کی قلت نے ان دونوں کو بے حس بنا دیا تھا عمر میں بڑا ہونے کے باعث گھیسو نے اس آگ کو زیادہ محسوس کیا تھا اور اسی وجہ سے وہ زیادہ ڈھیٹ اور بے شرم ہو گیا تھا۔پریم چند نے اس افسانے میں بھوک کو انسان کی بنیادی ضرورت کے طور پر پیش کیا ہے جس کے لیے وہ دو واقعات بیان کرتے ہیں اول تو ٹھاکر کی بارات میں دعوت کا واقعہ دوم کفن کے پیسے سے گوشت مچھلی کھانا اور شراب پینا۔ٹھاکر کی بارات میں جو کھانا گھیسو کو ملتا ہے اس کا بیان گھیسو ان لفظوں میں کرتا ہے:

''گھیسو کو اس وقت ٹھاکر کی بارات یاد آئی جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا۔اس دعوت میں اسے جو سیری نصیب ہوئی تھی وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی اور

آج بھی اس کی یاد تازہ تھی۔ بولا وہ بھوج نہیں بھولتا۔ تب سے پھر اس طرح کا کھانا بھر پیٹ نہیں ملا۔ لڑکی والوں نے سب کو پوڑیاں کھلائیں تھیں۔ سب کو چھوٹے بڑے سب نے پوڑیاں کھائیں اور اصلی گھی کی۔ چٹنی، رائتہ، تین طرح کے سوکھے ساگ، اے رسے دار ترکاری دہی چٹنی مٹھائی۔ اب کیا بتاؤں کے اس بھوج میں کتنا سواد ملا۔ کوئی روک نہیں تھی۔ جو چیز چاہے مانگو اور جتنا چاہو کھاؤ۔ لوگوں نے تو ایسا کھایا ایسا کھایا کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا۔ مگر پروسنے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم گول گول مہکتی کچوریاں ڈالے دیتے ہیں۔ منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہیے، پتل کو ہاتھ سے روکے ہوئے ہیں مگر وہ ہیں کہ دیے جاتے ہیں اور جب سب نے منہ دھولیا تو ایک ایک بیڑا پان بھی ملا۔ مگر مجھے پان لینے کی کہاں سدھ تھی۔ کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ چٹ پٹ جا کر اپنے کمبل پر لیٹ گیا ایسا دریا دل تھا وہ ٹھاکر، مادھو ان تکلفات کا مزہ لیتے ہوئے کہا 'اب کہاں کوئی ایسے بھوج کھلاتا ہے۔

اب کوئی کیا کھلائے گا۔ وہ جمانا دسرا تھا۔ اب تو سب کو کفایت سوجھی ہے۔

تم نے بیس پوڑیاں کھائی ہوں گی؟

بیس سے زیادہ کھائی تھیں نہ۔

میں پچاس کھا جاتا۔'' (۵)

اس اقتباس سے یہ واضح ہو جاتا کہ گھیسو کو گذشتہ بیس برسوں میں اس بارات کے علاوہ کبھی اچھا کھانا نہیں ملا۔ وہیں دوسری طرف مادھو کا یہ کہنا کہ میں پچاس کھا جاتا، اس کی ذہنی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے۔ یہی وہ بنیادی چیز ہے جس کے باعث وہ کفن کے پیسے سے کفن نہ خرید کر شراب اور لذیذ کھانا خریدتا ہے۔ کہانی کی پیش کش بہت جذباتی ہے۔ ویسے بھی فکشن میں جذباتیت کی کمی سے اس کا پلاٹ کمزور ہو جاتا ہے پیشکش کا انداز ایسا ہونا چاہیے کہ وہ قاری کو جذباتی بنا دے اور کہانی کے اختتام تک وہ اس سے جڑا رہے۔ اس افسانے کا کمال یہ ہے کہ جس کفن کی بات شروع سے اخیر تک ہوتی ہے نہ تو وہ کفن خریدا جاتا ہے اور نہ ہی استعمال ہوتا ہے اور نہ ہی بدھیا کی آخری رسومات ادا کی جاتی ہیں۔ ایک طرف جہاں بدھیا کا مردہ جسم بغیر کفن کے پڑا رہتا ہے۔ وہیں دوسری طرف وہ دونوں شراب خانے میں مدہوش ہو کر کبیر کا دوہا۔۔۔ ٹھگنی

کیوں نیناں جھمکاوے، ٹھگنی' گاتے ہوئے شراب خانے میں ہی گر جاتے ہیں۔

پریم چند نے اس افسانے میں بنیادی طور سے غریبی اور فاقہ کشی کے علاوہ انسان کی بے حسی اور کاہلی پر خوبصورتی سے روشنی ڈالی ہے۔اس افسانے میں یہ دونوں باپ بیٹے تب تک کوئی کام نہیں کرتے جب تک فاقہ کی نوبت نہ آجائے۔اس افسانے کا مرکزی خیال انسان کی بے ضمیری اور بے حسی ہے اس کے ساتھ ہی اس میں زمینداروں اور اعلی طبقہ کے خلاف ایک ردعمل بھی ہے۔گھیسو کو یہ احساس ہے کہ سماج میں رات دن محنت کرنے کے بعد بھی مزدوروں کو دو وقت کی روٹی آسانی سے میسر نہیں ہو پاتی ہے تو پھر ہم اتنا ہی کام کریں گے جس سے ہمارا گزر بسر ہو سکے۔وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کی محنت کا فائدہ کسی اور کو ملے اسی وجہ سے وہ کسی کی مزدوری کرنے کی جگہ لکڑی توڑ کر بازار میں بیچنا زیادہ بہتر سمجھا ہے۔

''اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کرتا تھا۔پھر بھی اسے یہ تسکین تو تھی یہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم از کم اسے کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بے جا فائدہ تو نہیں اٹھاتے۔''

گھیسو کے اسی رویے کی وجیہ سے گاؤں کے لوگ اس کو پسند نہیں کرتے۔گھیسو کے رویے میں یہ بدلاؤ زمینداروں کے مظالم اور استحصالی رویے کی وجہ سے ہوا کیونکہ وہ مزدوروں کو ان کی جائز مزدوری دینے کی جگہ ان کا استحصال کرتے ہیں۔

پریم چند نے بنیادی طور پر بھوک اور افلاس کو اس افسانے کا موضوع بنایا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان دنیا کے مسائل سے تنگ آکر ہی غلط کام کی طرف راغب ہوتا ہے اور ان مسائل کے سامنے اس کے نزدیک سماج و معاشرے کے تمام اصول و ضوابط بے معنی ہو جاتے ہیں۔

بھوک انسان کی بنیادی ضرورت ہے جو بعض اوقات اس کو جانور تک بننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ انسانی زندگی میں جو سب سے زیادہ اہم چیز ہے وہ انسان کے پیٹ کی بھوک ہے جس کی تکمیل کے لیے انسان تمام اخلاقی اقدار سے منہ موڑ کر غیر انسانی سلوک کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔منشی پریم چند نے اپنی کہانی بڑے گھر کی بیٹی میں اعتراف کیا ہے کہ بھوک سے پریشان انسان ذرا سی بات پر ناراض ہو جاتا ہے۔

پریم چند کا تعلق جس عہد سے تھا اس میں برطانوی حکومت کے ظلم و جبر اور بدانتظامی کے باعث

جہاں ملک تباہ ہو رہا تھا وہیں قحط سالی، متلف وبائی بیماریوں سے لوگوں کی زندگی متاثر ہو رہی تھی۔ دوسری طرف جاگیردار، ساہوکار، کسان اور سرمایہ داروں کا آپس میں تصادم چل رہا تھا۔ ان حالات میں عام آدمی کا اس سے متاثر ہونا ایک فطری امر تھا۔ دو وقت کی روٹی کے لیے عام آدمی کو طرح طرح کی پریشانیاں اٹھانی پڑتی تھیں۔ استحصال اور ظلم و ستم نے انسان کو حاشیے پر ڈال دیا تھا۔ اس ظلم اور استحصال کو پریم چند نے اس افسانے میں پیش کیا ہے۔ یہاں دیکھا جائے تو گھیسو اور مادھو پیدائشی کاہل اور بے حس نہیں ہیں بلکہ معاشرے نے انھیں ایسا بننے پر مجبور کیا ہے۔ ہمارا معاشرہ، اس کے فرسودہ رسم و رواج، معاشی تفریق، طبقاتی کشمکش کے ساتھ ہی مہاجنی نظام کے باعث ہونے والے استحصال نے ہی سماج میں گھیسو اور مادھو جیسے کرداروں کو پیدا کیا ہے۔ سماجی استحصال کے باعث ہی ان کے یہاں اخلاقی گراوٹ آئی ہے۔ ان کے لیے تمام رشتے ناطے اور اصول و ضوابط ان کے پیٹ کی بھوک کے سامنے چھوٹے پڑ جاتے ہیں۔ جس کے لیے وہ بذاتِ خود کم اور ان کا معاشرہ زیادہ ذمہ دار ہے۔ اسی بات کو اس افسانے میں اجاگر کیا گیا ہے۔ اس افسانے کی اہمیت پریم چند کے عہد میں جتنی تھی آج بھی اتنی ہی ہے اور یہی اس افسانے کی کامیابی کی دلیل ہے۔

☆☆☆

حواشی:

(۱)۔ اردو فکشن کے مضمرات۔ ابوالکلام قاسمی، صفحہ 241

(۲)۔ پریم چند کے شاہکار افسانے مرتب۔ اعجاز قادر، صفحہ 135

(۳)۔ پریم چند کے شاہکار افسانے۔ اعجاز قادر، صفحہ 141

(۴)۔ پریم چند کے شاہکار افسانے۔ اعجاز قادر، صفحہ 142

(۵)۔ پریم چند کے شاہکار افسانے، اعجاز قادر، صفحہ 138,139

(۶)۔ پریم چند کے شاہکار افسانے۔ اعجاز قادر، صفحہ 140

ڈاکٹر ریحانہ کوثر
Head, Department of Urdu, Lahor College for Womens, University of Lahor, Pakistan

زاہدہ حنا کے کالموں میں عورت کا تصور

ABSTRACT

"Kalum" is a word derived from English Language, which is written as "Column" in English and has literal meaning of page, a box, and a formation of soldiers. Urdu column writing earned fame in the 20th century. From there writers started to write columns in a new and modern way. Some writers choose a serious mode and some opted to write on speculations. Zahida Hina is an acclaimed Urdu columnist. She has written more than two thousand articles. She has not limited herself to a specific mode. That is why we can see a vast variety of topics in her columns. She has tired to cover different aspects of the socio cultural lives of people. She has discussed the modern women in her columns and the challenges she is facing in this modern times. She has presented modern women as an "Iron Lady". She has rebuilt the old image of woman when she was a dependent, weak and feeble creature.

Keywords: Column, Urdu, Women, Socio cultural lives, Urdu columnist, Modern Women

.....

اردو ادب میں مختلف اصناف کے لازوال شاہکار موجود ہیں۔ شاعری، افسانہ نگاری، مکتوب نگاری، تنقید و محققین وغیرہ کے ذریعے فنکاروں نے اپنے فن کے جلوے دکھائے۔ لیکن اردو ادب میں جتنی مقبولیت شاعری کو حاصل ہوئی وہ کسی صنف کو حاصل نہ ہو سکی۔ شاعری کے علاوہ بھی دیگر اصناف میں ماہرین فن نے اپنی طباعی اور خلاقی کے جوہر دکھائے۔ ان میں افسانہ نگاری کو آزادی کے بعد عروج حاصل ہوا اور آج بھی ملک و بیرون ملک بڑے بڑے افسانہ نگار موجود ہیں۔ جو اپنے قلم کے ذریعے جدید معاشرتی مسائل پر عصری تکنیک کے اثرات کے حوالے سے افسانے قلم بند کر رہے ہیں۔ مکتوب نگاری کے ذریعے بھی اپنی بات کو بے تکلفی سے بیان کرنے کا ہنر اپنایا گیا اور ایک مکتوب نگار اپنے مکتوب الیہ کی خدمت میں اپنی بات بلا جھجک پیش کرنے کی سعی کرتا رہا۔ اس فن میں مرزا غالب کو کمال حاصل تھا۔ تنقید نگاری کے میدان میں بھی ناقدین نے تخلیق کاروں کی نکیل کسنے کی کوشش کی اور تخلیق کاروں کے نقائص و محاسن کو پیش کرتے ہوئے تخلیقی رجحان کو صحت مند بنانے کی بڑی حد تک کامیاب کوششیں کیں۔

اسی طرح ادب کے افق پر کچھ فنکار ایسے بھی نمودار ہوئے جنھوں نے کالم نگاری کو اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کا وسیلہ بنایا اور اس کے ذریعے سماج کے مختلف مسائل اور ادب کی گوناگوں جہات پر لکھنے کی روایت قائم کی۔ ان کی تحریریں عام ادبی تحریروں سے بالکل الگ بلکہ نہایت شستہ، شگفتہ، عام فہم اور دلچسپ ہوا کرتی ہیں جو قاری کو یک گونہ لطف و انبساط کے احساس سے روشناس کراتی ہیں۔ جس میں زبان کی چاشنی کے ساتھ ساتھ زیر لب تبسم پیدا کرنے کی خوبی ہوتی ہے جسے پڑھ کر قاری اپنی تمام پریشانیاں بھول جاتا ہے اور ایک نئے جوش و خروش کے ساتھ تازہ دم ہو کر میدان عمل میں اترتا ہے۔ اردو ادب میں ادبی کالم نگاری ایک خوشگوار اضافے کا نام ہے جس میں طنز و مزاح کی ہلکی سی آمیزش بھی ہوتی ہے اور سنجیدگی کا پہلو بھی۔ یہی وہ اوصاف ہیں جو دیگر فنون کے مقابلے میں کالم نگاری کے فن کو ممتاز بناتی ہیں۔

کالم انگریزی زبان کا لفظ ہے جسے انگریزی میں Column تحریر کیا جاتا ہے جس کے لغوی معنی صفحے کا حصہ، خانہ، فوج کا دستہ ہونے کے ہیں۔ اصطلاحی طور پر کالم اخباری صفحے کا ایک صحافتی جزو ہے، جس میں کالم نگار اپنے مخصوص انداز میں کسی خاص موضوع پر اپنی دلچسپ تحریر نذرِ قارئین کرتا ہے۔

کالم نگاری کے بارے میں سید اقبال قادری لکھتے ہیں:

"کالم ایک ایسا صحافتی فیچر ہے جس میں کالم نویس منتخب موضوع پر اپنے مخصوص انداز میں

اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کسی بھی معاملے کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے''۔[1]

بیسویں صدی میں کالم نگاری نے عروج حاصل کیا اور کالم نگاروں نے نت نئے انداز سے کالم لکھنا شروع کیے۔ کہیں کوئی سنجیدہ کالم لکھا رہا ہوتا تو کہیں کسی کالم میں سوائے قیاس آرائیوں کے کچھ نہ ہوتا۔ اس حوالے سے ثاقب ریاض لکھتے ہیں:

''بیسویں صدی کے شروع میں کالم باقاعدہ عنوان کے تحت شائع ہونا شروع ہو گئے اس دور کے کالم غیر سنجیدگی اور قیاس آرائیوں کا مجموعہ تھے تاہم ہر شعبہ زندگی سے متعلق کالم لکھے گئے''۔[2]

عصر حاضر میں کالم نگاری کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کالم معاصر اردو صحافت کا ایک اہم جزو تصور کیا جاتا ہے۔ کسی بھی اخبار کے لیے اس سے صرف نظر ممکن نہیں ہے کالم میں اہم مسائل کا حل، پیچیدہ معاملات کی توضیح اور تازہ ترین خبروں پر نہایت منفرد زاویے سے روشنی ڈالی جاتی ہے لیکن اس تحریر میں اسلوب کی دلکشی اور زبان کی سلاست کو بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ کالم کی تحریر عام تحریوں سے قدرے منفرد ہوتی ہے اس کے اسلوب میں مزاح کی چاشنی اور زبان کی شوخی ہو تو اس تحریر کی تاثیر مزید کامیابی کی ضمانت تصور کی جاتی ہے۔ عام طور پر ادبی کالم نگاروں نے اس روش کو اپنایا ہے اور وہ اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب بھی ثابت ہوئے ہیں۔ جدید اردو لغت میں کالم نگاری کے معنی کچھ اس طرح سے درج ہیں:

''Column، اخبار کے صفحے کا ایک حصہ، اخبار یا بڑے سائز کی کتاب کے صفحے کو پڑھنے میں آسانی پیدا کرنے کے لیے حصوں یا کالموں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے''۔[3]

آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی ''کالم نگاری'' کی کوئی مستند تعریف موجود نہیں جیسے کہ ابھی تک انشائیہ کی کوئی جامع تعریف نہیں کی گئی۔ بعض کے خیال میں انشائیہ ایک ایسی مختصر تحریر جس میں مصنف زندگی کے بارے میں کسی موضوع پر بے ساختہ، سادہ اور شگفتہ انداز میں اظہارِ خیال کرے۔ بالکل اسی طرح ''کالم نگاری'' کی مخصوص تعریف نہیں لیکن اس بات سے ہم انکار نہیں کر سکتے کہ کالم نگاری کو فروغ صحافت ہی نے دیا۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''کالم نگاری کو فروغ صحافت سے ملا تھا لیکن اخبار کی خبروں اور اداریے کی معلومات اور تبصرے اور تجزیے کے مقابلے میں کالم نگار ہلکے پھلکے، شگفتہ اور لطیف انداز میں اظہار خیال کرتا ہے اور انشائیہ کے انداز میں موضوع کے انوکھے زاویے ابھارتا ہے''۔۴

کالم نگاری کا دائرہ کار اور دائرہ عمل اس قدر وسیع ہو گیا ہے کہ اس کی سیاسی، سماجی، ثقافتی، تہذیبی، تمدنی، اخلاقی، ہمہ گیر وسعت اور معنویت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ کالم کے موضوعات ہمارے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں ہزاروں ایسے موضوعات ہیں جن پر کالم لکھے جا سکتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ سے نشر اور شائع ہونے والی بین الاقوامی اور قومی خبریں، ادبی محفلیں، سیاستدانوں اور حکمرانوں کے بیانات، جرائم، حادثات، قومی اور علاقائی مسائل، بجٹ، مہنگائی، غربت، بے روزگاری، ایٹمی تباہ کاریاں، جنگی خطرات، تیل کا بحران، منشیات فروشی، جسم فروشی، تجارت، صنعت، مسلح افواج کے کارنامے، تعلیم اور صحت کے مسائل، نج کاری، بچوں کا اغوا ہونا اور تاوان، بسنت، موسم کی تبدیلی، زلزلہ اور طوفان، خشک سالی، سیلاب، رسوم و رواج، فیشن اور ایسے ہی ہزاروں موضوعات کالم نویسی کے موضوع بن سکتے ہیں۔

پروفیسر وارث میر لکھتے ہیں:

''زندگی کے کسی شعبے میں ہونے والی کسی عمل کے متعلق قلم کار کا ہلکے پھلکے انداز میں ایسا نامکمل اظہار خیال کالم کہلاتا ہے جو لکھنے والے کی اپنی اپروچ اور اپنے اسلوب کا مظہر ہو''۔۵

ہر اخبار میں مختلف عنوانات ہوتے ہیں اور انہی عنوانات کے تحت مختلف معلومات اور خبریں پڑھنے والوں تک پہنچتی ہیں۔ ان عنوانات کے تحت بعض اوقات سیاسی، معاشرتی اور سائنسی معلومات بھی قاری تک پہنچتی ہیں۔ روزمرہ کے واقعات اور حکومتی پالیسیاں بھی کالموں میں زیر بحث لائی جاتی ہیں۔ بعض اوقات کالم نویس دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے قارئین کو کسی آنے والے خطرے سے پہلے ہی آگاہ کر دیتا ہے اور صحافتی نقطہ نظر سے یہی کالم کہلاتا ہے۔

عبدالقادر حسن کے خیال میں:

''جس موضوع پر خبروں یا اداریے میں اظہار خیال نہ کیا جائے اس سے متعلق مستقل عنوان کے تحت کسی اخبار میں شائع ہونے والی تحریر کو کالم کہا جائے گا''۔۶

کالم نگاری ایک احساس ذمہ داری کا کام ہے۔ایک ایسی ذمہ داری جوانسان کوسکون سے سونے نہیں دیتی کہ اس کا یہ فرض ہے کہ سچ کو سچ، غلط کو غلط اور جھوٹ کو جھوٹ بتلائے۔ایک کالم نگار پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ حقائق کو جھوٹ کے پردوں سے عیاں کرے اور سچائی کے ساتھ عوام کے سامنے لائے اور معاشرے کو صحیح راہ پر چلنے کے لیے اکسائے انھیں نئے کل کی نوید سنائے جس نے ہر حال میں آنا ہے۔لیکن اس کے لیے کالم نگار کو اپنی تحریروں کے ذریعے اپنے قارئین کو حقائق سے آگاہ کرنا ہے۔

مذکورہ بالا بحث کو مدنظر رکھ کر جب ہم زاہدہ حنا کے اردو کالموں پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کے ہاں ہمیں کالم نگاری کے مخصوص موضوعات یعنی سیاسی، سماجی، معاشرتی، ادبی، تجزیاتی اور ذاتی تجربات و احساسات کے علاوہ ناول نگاری، افسانہ نگاری کے رنگ بھی بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ زاہدہ حنا ادب کی دنیا میں ایک ہمہ جہت شخصیت کی مالک ہیں اور جہاں زاہدہ حنا ناول نگار اور افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنی الگ پہچان رکھتی ہیں۔اس کے ساتھ ہی وہ ڈرامہ نگاری کے میدان میں بھی اپنے خاص اسلوب اور فکر کے حوالے سے مانی جاتی ہیں۔اس کے علاوہ زاہدہ حنا اپنے تنقیدی مضامین کے حوالوں سے بھی دور حاضر میں خاص پہچان رکھتی ہیں اور اپنی ہمہ جہت شخصیت کی وجہ سے زاہدہ حنا کے کالموں میں موضوعات کا تنوع نظر آتا ہے۔ان کے کالم کسی خاص سوچ، فکر یا فلسفے کی نمائندگی کرتے ہوئے اس کے گرد گھومتے نہیں ہیں بلکہ ان کے کالموں میں حالات حاضرہ کے تلخ تجربات سے لے کر معاشرے کے مختلف ادبی و سماجی اور معاشرتی پہلوؤں کو سمیٹا گیا ہے۔وہ اپنے کالموں میں حال کو ماضی اور ماضی کو موجودہ حالات کے ساتھ جوڑتی ہیں کیونکہ وہ ماضی پرست ہیں لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ ماضی کو حال پر ترجیح دیتی ہیں بلکہ وہ ماضی کے ان خوشگوار دنوں کو یاد کرتی ہیں جو نسل انسانی نے دیکھے تھے۔

زاہدہ حنا کی انہی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے انوار احمد لکھتے ہیں:

> ''وہ خود منقسم ہونے والے خانوادے کے کرب سے گزری ہیں اور پھر ایک باشعور قلمکار کے طور پر دنیا کو گلوبیت کے فریب میں جکڑ کر اسے نسلی، معاشی اور تہذیبی اعتبار سے تقسیم کرنے والوں کی حکمت عملی سے بھی واقف ہے اور اس امتیاز و استحصال کا نشانہ بننے والے مسلمانوں سے ہمدردی کے باوجود مسلم معاشروں کو پسماندہ رکھنے والی حکمران قوتوں کی نشاندہی کرتی ہے''۔[۷]

زاہدہ حنا کے کالموں کا جائزہ لیتے ہوئے جو چیز ان کی شخصیت کا احاطہ کرتی ہے اور ان کے کالموں میں جا بجا اس کا ذکر ملتا ہے۔ وہ ''صنف نازک'' یعنی ''عورت'' کا ذکر ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ وہ خود بھی عورت ہیں لیکن اس کے باوجود ''وجودِ زن'' کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ جڑی ان تکالیف و مصائب کا ذکر بھی ان کے کالموں میں ملتا ہے۔ زاہدہ حنا کے کالموں میں یہی عورت کئی رنگ و روپ میں سامنے آتی ہے کہیں تو ظلم کی چکی میں پس کر کندن بنتی ہے تو کہیں کسی پسماندہ علاقوں میں علم کی شمع روشن کیے بیٹھی ہے۔ کہیں ان کے ہاں یہ عورت آمریت کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

ان کے کالموں ''پہلی خواب دیکھنے والی''، ''مدیحہ گوہر: مزاحمت کی علامت''، ''رائیگانی کا سفر'' میں ہم ان عورتوں کو دیکھ سکتے ہیں جو عورت ہوتے ہوئے بھی ظلم کی چکی میں پسنا قبول نہیں کرتی:

> ''تھرپارکر کے نہایت غریب دلت خاندان میں پیدا ہونے والی کرشنا کماری کوہلی کے ماں باپ بندھوا کسان تھے۔۔۔ اپنے ماں باپ کے ساتھ کرشنا کماری نے بھی کئی برس تک بندھوا کسان ہونے کی ذلت بھگتی۔ کرشنا سے شاید کسی اڑتے ہوئے پرندے نے کان میں کہہ دیا تھا کہ کتاب اور کاغذ اس کی نجات کا پروانہ ہیں۔۔۔ کرشنا کماری نے مصیبت برداشت کی لیکن کتاب کو اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ یہی وہ جنون تھا جس کی بنا پر کرشنا کماری نے ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور وہ آگے بڑھتی گئی۔ یہ بھٹو خاندان کی جوہر شناسی ہے کہ انھوں نے کرشنا کماری کو سیاست کے میدان میں لانے کا فیصلہ کیا اور یہ ان کی حمایت اور تعاون تھا جس نے کرشنا کو پاکستانی سینٹ کا رکن بنا دیا''۔[۸]

زاہدہ حنا نے اپنے کالموں میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عورت پیدائشی طور پر مظلوم پیدا نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی دنیا کی پہلی عورت ''حوا'' نے یہ خواب دیکھا تھا کہ اس کی بیٹیوں کے ساتھ اس کے بیٹے ظلم کرتے جائیں اور یہ آنکھیں بند کر کے کبوتر کے مانند بیٹھی ظلم سہتی جائیں۔ کیا اس لیے تمہیں بھیجا تھا کہ تم اپنے حقوق، اپنے اختیارات کسی اور کے ہاتھوں میں تھما دو، کیوں تم نے ظلم کے خلاف آواز بلند نہ کی، کیوں تم نے ظلم کے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو بڑھنے سے نہ روکا، کیوں تم نے ان ہاتھوں کو کاٹ نہ ڈالا جنھوں نے نہ

جانے کتنی ہی حرمتوں کو پامال کیا:

''وہ اگر روئے زمین پر پہلی خواب دیکھنے والی تھیں تو وہ اپنے بیٹوں کو سرزنش کرتیں کہ تم نے میری بیٹیوں، نواسیوں اور پوتیوں کا کیا حال کیا ہے۔ ایسی طرح وہ بیٹیوں سے ناراض ہوتی کہ تم تو بہت تھڑدلی نکلیں۔ تم پر جب میرے بیٹوں نے ظلم شروع کیا تو تم نے ان کے خلاف بغاوت کیوں نہیں کی۔۔۔''۔9

ان کالموں سے معلوم ہوتا ہے کہ زاہدہ حنا صرف عورتوں پر ہونے والے مظالم کا ہی اظہار نہیں کرتیں بلکہ وہ ان مجبور و لاچار عورتوں کو ان مظالم سے بچنے کا سندیسہ بھی دیتی ہیں۔ اپنے کالم ''پہلی خواب دیکھنے والی'' میں وہ یہی بتانا چاہ رہی ہیں کہ اس مردوں کے معاشرے میں اگر ہم عورتوں نے کچھ حاصل کرنا ہے تو اس کے لیے ہر عورت کو تعلیم حاصل کرنا ہوگی۔ اسی تعلیم کی بدولت ہی عورت مردوں کا سامنا کر سکے گی۔ اس کے مظالم کے خلاف احتجا جکر سکے گی اور تبھی وہ انصاف حاصل کرنے لیے اپنی آواز بلند کرے گی جس کی گونج سے یہ معاشرہ لرز اٹھے گا۔ اسی لیے زاہدہ حنا اپنے کالموں میں عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے کا درس دیتی نظر آتی ہیں کیونکہ تعلیم ہی وہ واحد نجات کا زینہ ہے جس پر چلتے ہوئی ایک عورت اپنی تقدیر بدل سکتی ہے اور بتا سکتی ہے کہ وہ مردوں کے مظالم کے لیے اس دنیا میں نہیں آئی۔

زاہدہ حنا نے اپنے کالموں میں صرف مجبور و بے بس، لاچار عورتوں کا ہی ذکر نہیں کیا بلکہ انھوں نے معاشرے کے ہر طبقہ کی عورت کا ذکر کیا ہے۔ چاہے وہ کمزور ہو یا طاقت ور یا اس نے آمریت کے آگے دیوار بن کر کھڑے ہونے کو ترجیح دی ہو، ایسی ہی عورتیں زاہدہ حنا کے کالموں کا موضوع رہی ہیں۔ ان کے کالموں ''رائیگانی کا سفر''، ''مدیحہ گوہر؛ مزاحمت کی علامت''، ''دنیا کی بیٹی''، اور ''کلثوم نواز یاد آئیں'' میں ہم ان عورتوں کو باخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ جنھوں نے آمریت اور انتہا پسندوں کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا جنھوں نے دنیا کو یہ پیغام دیا کہ عورت کو کمزور نہ سمجھا جائے اس کی ایک خوبصورت مثال ان کے کالم ''دنیا کی بیٹی'' میں دیکھی جا سکتی ہے جس میں سوات کے ایک خاندان کی چھوٹی سی لڑکی نے بڑے بڑے دہشت گردوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ جو یہ ماننے پر تیار ہی نہیں تھے کہ جن کے ناموں سے دنیا ڈرتی ہے ایک چھوٹی سی بچی ان انتہا پسندوں کا ذکر کر رہی ہے۔ وہ چھوٹی سی بچی جو ''گل مکئی'' کے نام سے ڈائری لکھتی تھی۔ جس کی یہ ڈائری راتوں رات پوری دنیا میں مشہور ہوئی کیونکہ اس عالمی دنیا کی تمام نظر سوات میں ہونے والی انتہا پسندی ہی کی جانب تھی اس سے انتہا

پسندوں کی تنظیموں کو بہت نقصان پہنچ رہا تھا۔انھوں نے اس بچی کو دھمکیاں بھی دیں۔کیونکہ وہ انتہا پسند لوگ پاکستان میں اپنی مرضی کی شریعت جبراً نافذ کرنا چاہتے تھے۔لیکن اس چھوٹی سی بچی نے ان کی دھمکیوں کی پرواہ نہ کی اور آخر ایک دن اسے اور اس کی ساتھی دوستوں کو اسکول سے واپس آتے ہوئے خون میں نہلا دیا گیا:

''بہت دنوں تک ہمارے یہاں اس کا نام سرگوشیوں میں لیا جاتا تھا لیکن انتہا پسندی ہمارے یہاں سے پسپا ہوئی۔عسکریت پسندوں کی خواہشوں کے خلاف قدم بہ قدم انھیں پیچھے ہٹنا پڑا اس دوران اسے امن کا نوبل انعام ملا''۔[۱۰]

عورت کا یہی کردار ہمیں زاہدہ حنا کے کالم ''کلثوم نواز یاد آئیں'' میں بھی نظر آتا ہے۔جہاں کلثوم نواز جیسی مضبوط عورت اس وقت کی آمریت کے سامنے ایسے کھڑی ہوئیں کہ آخر ساری دنیا کو ان کی طرف توجہ کرنا پڑی۔انھوں نے اس وقت کی آمریت کے خلاف آواز اٹھائی اور سیاسی جدوجہد کا آغاز کیا اور جس کی راہ میں سب سے زیادہ روڑے ان کی پارٹی کے بعض سربراہ رہنماؤں نے اٹکائے۔لیکن کلثوم نواز ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹی:

''۲۰۰۰ء میں کلثوم نواز سیاسی جدوجہد کا آغاز چاہتی تھیں لیکن ان کی راہ میں سب سے زیادہ روڑے مسلم لیگ (ن) کے بعض سرکردہ رہنماؤں نے اٹکائے۔ان میں سے اکثر کے خیال میں نواز شریف ایک بھاری بوجھ ہیں جسے اگر فوراً اتار پھینکا جائے تو ان لوگوں کے اقتدار کی کشتی ایک بار پھر آمریت کے سمندر میں رواں دواں ہو سکتی ہے۔۔۔''[۱۱]

زاہدہ حنا کے کالموں کی عورت ایک مضبوط عورت ہے جو ہر حال میں اپنے آپ کو کھڑا رکھتی ہے چاہے اس کا کوئی ساتھ دے یا نہ دے، چاہے اس کے ساتھ کوئی کھڑا ہو یا نہ کھڑا ہو۔یہ عورت اپنی تمام صلاحیتوں کو منوانا جانتی ہے۔اس مردوں کے معاشرے میں ایک عورت کو اپنی بات بتانے کے لیے کس کس مقام پر لڑنا پڑتا ہے یہ زاہدہ حنا کا کمال ہے کہ وہ نہایت مہارت سے اس چیز کو صفحۂ قرطاس پر اتارتی ہیں۔اپنے کالم ''کلثوم نواز یاد آئیں'' میں انھوں نے ایسی ہی عورت کو موضوع قلم بنایا ہے جو آمریت کے خلاف کھڑی ہوئی جن کے مقاصد کو پورا کرنے سے روکنے کے لیے ان کے قافلے کو روکا گیا۔ان کی گاڑی کو کرین سے اٹھا لیا گیا جس میں کلثوم نواز دس گھنٹوں تک بند رہیں یہ ایک عورت ہی کا صبر اور ہمت ہے جو تنہا ہونے کے باوجود آمریت کے سامنے نہ جھکیں اور آخر ساری دنیا ان کی ہمت و اہلیت کی قائل ہو گئی۔

زاہدہ حنا کے کالموں میں ہمیں عورت فنکار کی صورت میں بھی نظر آتی ہے۔ایک ایسی عورت جس نے ساری زندگی اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرایا ہے جس کی جیتی جاگتی مثال ہمارے سامنے ''اجوکا تھیٹر'' کی ہے۔زاہدہ حنا کے کالموں میں بسنے والی عورت کوئی معمولی عورت نہیں ہے کیونکہ وہ آج کے زمانے کی عورتیں ہیں جن کے اندر غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہنے کی ہمت ہے جو آمریت کے زبردست زمانے میں بھی وہی کرنا چاہتی ہیں جس کے ذریعے معاشرے میں سچ کا بول بالا ہو اور جھوٹ کا پردہ چاک ہو۔زاہدہ حنا کا کالم ''مدیحہ گوہر؛ مزاحمت کی علامت'' اس کا منہ بولتا ثبوت ہے:

> ''مدیحہ گوہر اور شاہد ندیم نے ''اجوکا'' کے نام سے تھیٹر گروپ اس وقت قائم کیا جب اس جرات کا تصور بھی محال تھا۔وہ زمانہ جب خود ساختہ امیر المومنین جنرل ضیاء الحق پورے جاہ وجلال کے ساتھ اس ملک پر حکومت کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ لوگوں کے اخلاق کی نگہبانی ان کی ذاتی ذمہ داری ہے۔۔۔لیکن ''اجوکا'' اور اس جیسے کئی دوسرے تھیٹر گروپوں نے ان کی یہ خوش گمانی خاک میں ملادی'' ۔[۱۲]

زاہدہ حنا کے کالموں کی عورت کوئی عام عورت نہیں ہے بلکہ یہ ہر لحاظ سے خاص ہے کیونکہ یہ عورت ہمارے معاشرے کا حصہ ہے اور معاشرے میں ہونے والی ہر زیادتی کا اثر براہ راست اس عورت پر پڑتا ہے۔زاہدہ حنا کے کالموں میں ہمیں عورت سیاستدان کے روپ میں بھی دکھائی دیتی ہے تو کہیں یہ عورت انصاف کی دیوی کے روپ میں عاصمہ جہانگیر کی شکل میں نظر آتی ہے تو کہیں درس وتدریس جیسے پاکیزہ عمل کو پھیلاتی ہوئی طاہرہ حسین جو مضافاتی علاقوں میں بچوں کو ادب وآداب سکھاتی ہے،تو کہیں ایوان بالا میں بیٹھی کرشنا کماری کوہلی جو جاگیرداروں کی دی ہوئی ذلت سے خود کو نکال کر اس مقام تک پہنچتی ہے۔غرض زاہدہ حنا کے کالموں میں ہمیں عورت ہر رنگ،روپ،نسل میں نظر آتی ہے۔ان کے کالم ''رائیگانی کا سفر'' میں ہمیں سمجھ بوجھ رکھنے والی عورت نظر آتی ہے جو اس فکر میں لاحق ہے کہ مغربی پاکستان کی پالیسیوں سے کہیں ایسا نہ ہو کہ مشرقی پاکستان والے اپنے آپ کو کم تر محسوس کرنے لگیں۔لیکن جہاں اللہ تعالیٰ نے مردوں کو طاقت دی ہے وہیں عورت کو چھٹی حس بھی عطا کی ہے جس کے سبب وہ اپنے سامنے ہونے والے واقعات و حالات کی روشنی میں دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے مستقبل کے آنے والے خطرات کو محسوس کر لیتی ہے:

> ''پاکستانی سیاست کے ابتدائی دس برسوں کی جب تاریخ لکھی جاتی ہے تو بیگم شائستہ

کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔۔۔۲۴ فروری ۱۹۴۸ء کو انھوں نے وزیر اعظم اور دیگر اراکین اسمبلی کے سامنے یہ جملہ کہا کہ مشرقی پاکستانیوں میں یہ احساس پرورش پا رہا ہے کہ انھیں نظر انداز کیا جا رہا ہے ہمیں اس احساس کو کھرچ پھینکنے کے لیے حتی المقدور سب کچھ کرنا چاہیے۔ان کی یہ اختلافی تقریر چٹکیوں میں اڑا دی گئی اور وزیر اعظم نے یہ کہہ کر بات ختم کی کہ مجھے معلوم ہے کہ عورتوں کو مشکلات کا اندازہ نہیں ہوتا۔۔۔۲۴ فروری کا دن تمام ہوا لیکن شائستہ سہروردی کا یہ جملہ اٹل ثابت ہوا''۔۱۳

زاہدہ حنا کے کالم کی عورت عقل و شعور کی حامل عورت ہے جس کے سینے میں ایک نرم دل ہے جسے نہ صرف اپنے ملک کے لوگوں کا خیال ہے بلکہ وہ ان لوگوں کا بھی درد اپنے سینے میں رکھتی ہے جو تھوڑی مقدار میں ہمارے ملک میں رہتے ہیں جن کے حقوق کے لیے اس نے آواز اٹھائی تو اس کو چپ کرا دیا گیا۔ جس کے لیے انسان کی خدمت بلا امتیاز ہی اس کا سب کچھ تھا:

''وہ برصغیر کی اس مسلم اشرافیہ سے تعلق رکھتی تھیں جس کے لیے سیاست عبادت تھی اور جس کا دل نسلی، لسانی اور صوبائی تعصّبات سے پاک تھا''۔۱۴

زاہدہ حنا کے کالموں میں ہمیں ان عورتوں کا بھی ذکر ملتا ہے جنھوں نے سچ بولنے کے بدلے میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔جنھوں نے سچ کی بالادستی کے لیے اپنی جان پر مظالم برداشت کیے تا کہ کوئی ان کو یہ نہ کہہ سکے کہ تم نے اپنے ایمان بیچ ڈالے تھے۔تاریخ گواہ ہے کہ جنگ آزادی، آزادی اور ملکی سیاست کے خلاف آواز اٹھانے پر ان عورتوں نے مردوں کے شانہ بشانہ ساتھ دیا تبھی تاریخ ان عورتوں کو آج سلام پیش کرتی ہے جنھوں نے ہر قدم پر اپنے لوگوں کے حقوق، ان کو آمرانہ غلامی سے آزادی دلانے کے لیے ہر قدم پر آواز بلند کی۔اس حوالے سے زاہدہ حنا نے اپنے کالم ''ایشیا کی قیدی عورتیں'' میں ان عورتوں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کیں صرف و صرف اپنے لوگوں کا مستقبل بدلنے کے لیے، یہاں تک کہ شہنشاہ اورنگ زیب کی چہیتی بیٹی شہزادی زیب النساء نے بھی اپنے باپ کی طرف سے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں:

''ہم شہزادی زیب النساء کی اذیت کے بارے میں سوچ نہیں سکتے کہ جب شہنشاہ اورنگ زیب کے حکم پر سلیم گڑھ کے قلعے میں قید کی گئی۔۔۔شہنشاہ جان سے عزیز بیٹیوں کو حرف

غلط کی طرح مٹا دیتے ہیں انھیں قید تنہائی میں ڈال کر بھول جاتے ہیں۔۔۔زیب النساء نیم نابینا ہوئی تو اس نے شہنشاہ سے عینک کی درخواست کی جو رد کر دی گئی تھی"۔۱۵

زاہدہ حنا نے اپنے کالموں میں موجودہ زمانے کی ان عورتوں کی قید و بند کا بھی ذکر کیا ہے جو تاریخ میں بہت مقبولیت رکھتی تھیں اس وقت کے ظالم آمر کی قید و بند ہیں کس طرح وہ عورت زندہ رہی:

"بے نظیر بھٹو کو جس نوعیت کی ذہنی اور جسمانی اذیتیں دی گئیں اس کے نتیجے میں وہ سماعت سے بڑی حد تک محروم ہو گئیں۔ اپنی رہائی کے بعد انھیں کئی آپریشن کرانے پڑے۔۔۔ میرا زیادہ وقت قید تنہائی میں گزرتا، مجھے اخباروں اور کتابوں سے محروم رکھا جاتا۔ میں اگر لکھنے کے لیے کاغذ مانگتی تو کئی دن گزرنے کے بعد کاغذ کا صرف ایک ورق دیا جاتا"۔۱۶

زاہدہ حنا نے اپنے کالموں میں ایشیا کی عورتوں کے ذکر کے ساتھ یورپین، رومن، برطانوی، روسی، مصری اور امریکی جیلوں میں بند عورتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے پر ہر ملک، ہر خطے کی عورتوں نے ظلم و ستم برداشت کیا لیکن کبھی بھی ان کے آگے سر نہ جھکایا:

"۱۹۷۴ء میں ہماری ملاقات مادام رولانڈ سے ہوتی ہے جس پر الزام لگایا گیا تھا کہ اس نے گھر بار سنبھالنے کے بجائے سیاست کے میدان میں قدم رکھا جو عورتوں کے لیے ممنوع تھا۔۔۔اپنے سیاسی خیالات اور دوستوں کے انتخاب کی بنیاد پر وہ قید ہوئی"۔۱۷

زاہدہ حنا کے کالموں کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت ہر دور، زمانے، عہد میں ظلم و بربریت کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑی رہی ہے۔ زاہدہ حنا کے کالموں کی عورت کوئی عام عورت نہیں ہے بلکہ وہ جانتی ہے کہ کیسے ظلم کے سامنے ڈٹے رہنا ہے چاہے اس بنا پر اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ ایسی ہی عورتوں کے لیے تو نپولین نے کہا تھا کہ تم مجھے اچھی مائیں دو میں تمھیں بہترین قوم بنا دوں گا۔ ایسی ہی عورتیں ہمیں زاہدہ حنا کے کالموں کا احاطہ کیے نظر آ رہی ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات

1۔اقبال قادری، سید۔رہبر اخبار نویسی۔نئی دہلی: ترقی اردو بیورو۔۱۹۸۹ء۔ص۳۰۰

2۔ثاقب ریاض۔جدید صحافت اور ابلاغ نامہ۔لاہور: اردو سائنس بورڈ۔۲۰۰۳ء۔ص۱۱۰

3۔اشرف ندیم۔جدید اردو لغت۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان۔۲۰۱۲ء۔ص۵۵۵

4۔انور سدید، ڈاکٹر۔سخن ہائے گسترانہ (مرتبہ)۔کراچی: قلی سنز (پرائیویٹ)۔۲۰۰۷ء۔ص۱۲

5۔شفیق جالندھری، ڈاکٹر۔صحافت اور ابلاغ۔لاہور: اے ون پبلشرز۔۲۰۰۸ء۔ص۱۰۲

6۔ثاقب ریاض۔جدید صحافت اور ابلاغ نامہ۔لاہور: اردو سائنس بورڈ۔۲۰۰۳ء۔ص۱۱۱۔۱۱۲

7۔مقتدا منصور۔ہم سب۔زاہدہ حنا کا خانہ تنہائی۔۲۴ اگست۔۲۰۱۷ء

8۔زاہدہ حنا۔نرم گرم۔پہلی خواب دیکھنے والی۔روزنامہ ایکسپریس۔لاہور: ۱۱ مارچ ۲۰۱۸ء

9۔ایضاً

10۔زاہدہ حنا۔نرم گرم۔دنیا کی بیٹی۔روزنامہ ایکسپریس۔لاہور: ۱۴ اپریل ۲۰۱۸ء

11۔زاہدہ حنا۔نرم گرم۔کلثوم نواز یاد آئیں۔روزنامہ ایکسپریس۔لاہور: ۲۵ اپریل ۲۰۱۸ء

12۔زاہدہ حنا۔نرم گرم۔مدیحہ گوہر؛ مزاحمت کی علامت۔روزنامہ ایکسپریس۔لاہور: ۲۹ اپریل ۲۰۱۸ء

13۔زاہدہ حنا۔نرم گرم۔رائیگانی کا سفر۔روزنامہ ایکسپریس۔لاہور: ۲۷ مئی ۲۰۱۸ء

14۔ایضاً

15۔زاہدہ حنا۔نرم گرم۔رائیگانی کا سفر۔روزنامہ ایکسپریس۔لاہور: یکم اگست ۲۰۱۸ء

16۔ایضاً

17۔ایضاً

ڈاکٹر عارف اشتیاق
Assistant Professor, Satyawati College, University of Delhi

فکر دینی کی تثلیث

اقبال، مولانا علی میاں ندوی اور قاضی محمد عدیل عباسی

قاضی عدیل عباسی ایک وکیل، مجاہد آزادی، صحافی، صاحب طرز ادیب، سیاستداں اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے معروف ہیں۔ وہ بیسویں صدی میں مسلمانوں کی بنیادی اور صالح تعلیم کی فکر کرنے والی چند ہستیوں میں سے ایک ہیں۔ ان کی ایک دوسری حیثیت اقبال شناس کی بھی ہے جنہوں نے عالم اسلام کی ایک عبقری شخصیت اور اقبال شناس علامہ سید ابوالحسن علی ندوی (علی میاں) کی فکر سے روشنی حاصل کی اور بڑے کارنامے انجام دیئے۔ دینی تعلیمی قونسل کی بنیاد اسی صائب فکر کا نتیجہ ہے۔ جس کے مقاصد مسلمانوں میں دینی ادارے قائم کرنا اور اردو تعلیم کے ذریعہ ایسے نصاب تیار کرنا جو دین وایمان کی بقا اور ترویج واشاعت کا حامل ہو اور ساتھ ہی جدید تقاضوں سے بھی آشنا رہے۔

ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد مسلمان دھیرے دھیرے سماجی ومعاشی اور تعلیمی سطح پر کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا۔ جہاں ایک طرف مسلم دانشوروں کا ایک بڑا طبقہ نقل مکانی کر کے پاکستان جا بسا تھا وہیں بعض اہل علم ایسے بھی تھے جنہوں نے ملک کی سالمیت، اس کی بقا کو اپنا نصب العین بنائے رکھا اور دیگر قدروں کے ساتھ حسن سلوک، آپسی بھائی چارہ اور تعلیم کو فروغ دینے میں تعاون کیا۔ لیکن ہندوستان کے ایک سیکولر اسٹیٹ بن جانے کے بعد مسلمانوں کی نئی نسل کے لیے اسلام کے بنیادی عقائد اور اپنے قدیم ملی تشخص اور امتیاز کے ساتھ زندگی گزارنا ایک اہم مسئلہ تھا۔

وہیں دوسری طرف حکومت کی مشنری کے موثر افراد کی وجہ سے فطرتاً اس میں سارے فرقوں کے ساتھ یکساں اور مساویانہ طرز عمل کا باقی رہنا نہایت دشوار تھا۔ ماضی کی تلخیاں، پاکستان کے قیام اور ہندو

احیائیت اور غیر مذہبی نصاب کے واضعین کی فرقہ وارانہ ذہنیت بھی کارفرما تھی۔ بنیادی نصاب تعلیم میں ہندو دیومالا کی باتیں اوغیر سیکولر کہانیاں صاف طور پر شامل کیے جانے لگے۔

بعض صاحب بصیرت جن میں قاضی عدیل عباسی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی پیش پیش ہیں یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ کس طرح ملک کا بنیادی نصاب جن میں اخلاقیات اور سبق آموز قصے کہانیوں پر مشتمل ہوتا کہ ملک کے سیکولر کردار کو بحال رکھا جائے اور کسی خاص مذہب یا فرقے کی تلقین وتبلیغ سرکاری پلیٹ فارم سے نہ ہو۔

اس تعلق سے ایک پیش رفت یہ ہوئی کہ مسلمان بیسک اور بنیادی تعلیم کا انتظام اپنے بچوں کے لیے خود کریں۔ اس کے لیے مدارس اور مکاتب قائم کیے جائیں جن مسلمان گھرانوں کے بچوں کی ابتدائی تعلیم اردو عقائد اور مذہب ودینیات کے مطابق ہو۔ جس سے اپنے بچوں کی ذہن سازی ہو سکے۔

اس مقصد کے لیے قاضی عدیل عباسی نے اپنی پوری توانائی اور اپنی تمام ذہنی صلاحیتیں صرف کیں۔ جس کے لیے ۱۹۵۵ سے ہی بلکہ انجمن ترقی اردو ہند میں ۱۹۵۰ میں بستی میں شاخ کے قیام سے شروع کر دی تھی۔ قاضی صاحب نے دینی ادارے قائم کرنے اور ابتدائی دینی تعلیم کے لیے ایک منصوبہ بنانے کے بعد ضلعی سطح پر انجمن تعلیمات دین قائم کی۔ جس میں مدارس کو خود کفیل بنانے کے لیے انہوں نے چٹکی اور کھلیانی وصول کرنے کا طریقہ رائج کیا۔ اس تحریک کی کامیابی پر دینی تعلیمی کونسل کے قیام کا منصوبہ بنا کر دانشوروں کی ایک کانفرنس بلائی اور دینی تعلیمی کونسل کا قیام عمل میں آیا۔ اس منصوبے کے پس پشت عالمی شہرت یافتہ عالم دین مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کاوش شامل تھی۔ جنہوں نے قاضی صاحب سے اصرار کیا کہ اپنے دائرہ سے باہر نکل کر ضلعی سطح کے بجائے صوبائی سطح پر کام کریں۔

بالآخر ۳۰/۳۱ر دسمبر ۱۹۵۹، یکم جنوری ۱۹۶۰ کی تاریخوں میں صوبائی دینی کانفرنس بلائی۔ جس میں ملک کے کونے کونے سے اہل علم ودانش حضرات اور دانشوروں کو دعوت دی گئی اور مشورے لیے گئے۔ اس کے صدر بھی مولانا علی میاں ندوی کو ہی بنایا گیا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کا خیال ہے:

> ہندوستانی مسلمانوں کی ملی تشخص اور ان کے بنیادی مسائل کی تاریخ لکھنے والا اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ تقسیم ہند کے بعد مشکل سے دو ایک تحریکیں ہوں گی جو دینی تعلیمی کونسل کی طرح ٹھوس بنیادی اور وقت کے اہم ترین مسئلہ پر شروع کی گئی ہوں۔"(۱)

قاضی صاحب شروع سے ہی اقبال سے دیرینہ الفت ومحبت کرتے تھے اور زندگی بھر ان کے فکر وخیال کا مجسم آئینہ بنے رہے۔ قاضی صاحب کی ہم جہت شخصیت سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ قوم کا سچا درد رکھتے تھے اور اس کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اقبال کے روزانہ بلا چند سوا شعار پڑھے مجھے چین نہ آتا تھا۔ اخبار زمیندار کی عظیم مشغولیت کے زمانے میں بھی جسے جہاد سمجھ کر ہم لوگ نکال رہے تھے۔ میرا یہ مشغلہ بند نہیں ہوا۔ (۲)

اقبال سے ذہنی ہم آہنگی اور ان کے فکر وخیال کے مطالعہ سے جو تاثر قاضی صاحب کے دل پر قائم ہوا وہ یہ کہ اقبالؔ نے اپنی نظموں میں جن تعلیمات کی شرح کی ہیں وہ اسلامی فکر سے متاثر ہیں۔ اور جیسے جیسے اقبالؔ کی شاعری مزید سامنے آتی گئی یقین میں پختگی آتی گئی۔ قاضی صاحب کی نظر میں اقبال کے تئیں عقیدت واحترام کا یہ عالم تھا کہ گفتگو کے دوران کسی کے نزدیک جہاں کوئی کسر نظر آتی تھی پیمانہ صبر لبریز ہو جاتا تھا اور قوت برداشت جواب دے دیتی تھی۔

زمیندار کی ادارت سے سبکدوشی پر لاہور سے واپسی کے بعد مجنوں گورکھپوری کا مضمون بعنوان ''اقبال'' منظر عام پر آیا جس میں اقبالؔ کو کمتر شاعر بتایا گیا تھا۔ اس وقت جواب میں قاضی صاحب نے چند مضامین قلم بند کیے تھے جس میں سے صرف دو شائع ہو سکے باقی بعد میں نظر ثانی کے بعد ''اقبال کا فلسفہ حیات وشاعری'' کے عنوان سے شائع ہوا اور ہر خاص وعام میں مقبول ہوا۔ جس سے قاضی عدیل عباسی شخصیت کے جہاں دیگر جہات کے حامل تھے وہیں اقبالؔ شناس کی حیثیت کے متحمل ہوئے۔

قاضی صاحب اقبالؔ کے فلسفے اور فکری سرچشمے کو قران وحدیث کی دین تصور کرتے ہیں وہ کہتے ہیں

> ''اس کے موضوعات گفتگو اسلامی اس کے افکار اسلامی اس نوعیت بحث اسلامی
> چنانچہ ان سب کی شرح میں اقبال کے اشعار اسلامی اور صرف اسلامی۔'' (۳)

اس سلسلے میں مولانا ندوی کی رائے بے محل نہیں کہ اقبال کا یقین عقیدہ ومحبت کا ایسا حسین امتزاج ہے جو اس کے قلب ووجدان، اس کی عقل وفکر، اس کے ادارہ تصرف، اس کی دوستی ودشمنی غرض کی اس کی ساری زندگی پر چھایا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اسلام اور اس کے پیغام کے بارے میں راسخ الایمان تھے۔ (۴)

ان کی اس رائے سے سو فیصد اتفاق کرنا پڑے گا کہ اقبال کو فلسفی شاعر عرف عام کے معنوں میں قرار دینا سخت غلطی ہے۔ دراصل ایک مجدد تھا اور اس نے عجمی تفصیلات اور غیر اسلامی

افکار کے بجائے خالص اسلامی تصورات کو پیش کرنے کے لیے ارادتاً اشعار لکھے ہیں۔

علامہ اقبال نے اپنے گرد و پیش سے جس طرح سروکار رکھا اور جس طرح تہذیبی، سیاسی، فلسفیانہ، اور سماجی یلغار پر اپنے ردعمل کا ہر دور میں اظہار کیا اس کی کوئی دوسری مثال برصغیر کے مسلم دانشوروں میں مشکل سے تلاش کی جاسکتی ہے۔ مولانا ندوی بھی انہیں صفات کے متحمل تھے۔ ان کا خیال ہے کہ جہاں اقبال عصری نظام تعلیم پر تنقید کرتے ہین اس سے ان کی مراد جدید مغربی تعلیم کے علاوہ اور کچھ نہیں، جو لادینیت کی طرف لے جاتی ہے۔(۵)

قاضی عدیل عباسی کی تحریک ''دینی تعلیمی'' کونسل کے پس پشت اقبال کی فکر کارفرما نظر آتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ علم ایک وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے اور اس میں دیگر علوم کے ساتھ ساتھ سائنس بھی شامل ہے۔ محمدؐ نے کہا ہے کہ اطلب العلم ولوکان بالصین (علم حاصل کرو خواہ وہ چین میں ملے) لیکن بعد میں اس حدیث کی توجیہات مین علم سے مراد صرف علم دین لے لیا گیا۔ اقبال کے نزدیک ترکوں کی عظمت کا راز جدید علوم تھے لیکن جب یورپ میں علم کی روشنی آئی تو ترکون نے اس سے اجتناب کیا اسی لیے ان کی حکمرانی بھی جاتی رہی، قاضی عدیل عباسی کا خیال ہے کہ دنیائے اسلام کے مدارس بالخصوص ہندوستان میں مذہبیات کے علاوہ جن سے مراد قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم ہے اس میں صرف آرٹ کے بعض اجزاء کی تعلیم دی جاتی ہے مثلاً قدیم فلسفہ، قدیم منطق وغیر۔ سائنس کی تعلیم شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی ہے اور علوم جدیدہ سے اجتناب و اعتراض عین اسلام تصور کیا جاتا ہے۔ قاضی عدیل عباسی نے شعارنا الوحید الی الاسلام من جدید یعنی جدید علوم کو اسلامی روح کے ساتھ رائج کرنے کو ایک مشن کے طور پر شروع کیا اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔

قاضی عدیل عباسی ایک سیاستداں بھی تھے وہ اقبال کے فکر وفن پر گہری نظر رکھتے ہیں اقبال کے نزدیک تصور وطنیت ہو یا تصور جمہوریت اگر اس میں انسانیت کی فکر اور صالح قدروں کی پاسداری نہ ہو تو یہ سب بیکار ہیں۔ اقبال کا خیال ہے کہ عالم میں ایک ایسی حکومت قائم کرنا چاہیے جو قید وطن سے آزاد ہو اور جس کی اساس سرحدوں پر نہیں بلکہ اصول وقوانین شرع پر ہو۔ اس سلسلے میں علامہ جمال الدین افغانی کے ہم خیال ہیں۔

اقبال کی فکر ونظر میں عالمگیریت اور آفاقیت اسلام اور صرف اسلام ہی میں پنہا ہے نہ کہ جیسا کہ مجنوں گورکھپوری کے مطابق اقبال کا پیام اس حیثیت سے محدود ہے کہ وہ اسلام اور حقائق اسلام کی شرح ہے۔(۶)

اقبال کی نظر میں اسلام ایک ایسا طرز زندگی ہے جس کے اندر تمام مصائب ومشکلات کا مداوا کرنے کی صلاحیت ہے اور محمدؐ انسانیت کے نجات دہندہ ہیں قاضی عدیل عباسی کی کتاب ''اقبال کا فلسفہ حیات اور شاعری'' کے اسباق مثلاً اقبال اور اسلام، خاتم النبیینؐ، مقام نبوت، رسالت، نیابت الٰہی، عشق رسول، اقبال کا تصور مدینہ وغیرہ کو اسی تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اور وہ ایک طرف اس زمانے کے تمام مفکرین کی طرح اتحاد اسلام (پین اسلام ازم) کے ذریعے اسلام کا دینوی اقدار واپس لانا چاہتے تھے اور دوسری طرف ملت اسلامیہ میں جو غلط نظریات پیوست ہو گئے تھے ان کی اصلاح کرنے کے خواہش مند تھے۔۔۔ اس طرح اقبال نہ صرف ایک مفکر اسلام تھا بلکہ ایک مجدد تھا اور اس نے آب سرچشمہ اسلام سے تشنگان معرفت کو سیراب کیا ہے۔ (۷)

قاضی صاحب اقبالؔ کے سلسلے میں اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں زمانہ طالب علمی سے ہی اقبالؔ کی نظم، ابوالکلام آزاد کی نثر اور حسرت موہانی کے عمل کا بڑا معتقد رہا اور بڑے ذوق وشوق سے ان تینوں کا مطالعہ کرتا تھا۔

مولانا ندوی کی طرح قاضی صاحب بھی اقبال کو کوئی انسانی صفات سے اعلیٰ وارفع چیز تصور نہیں کرتے بلکہ اقبال کی صاف گوئی کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ ایک دن اقبال نے مجھ سے کہا کہ آپ وسط ایشیا میں جا کر کام کیجیے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب وسط ایشیا، روس اور اسلامی اقتدار کی کشمکش میں تھا اقبال نے کہا کہ آپ دریافت کریں گے کہ میں خود وسط ایشیا کیوں نہیں جاتا۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے اندر جذبہ ہے لیکن ہمت کی کمی ہے۔ شعر میں اقبال نے کہا تھا کہ

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

لیکن بقول قاضی عدیل عباسی جن لوگوں نے کسی شاعر کے کلام کو اس کے عمل کے مطابق کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہیں بہت دور از کار دلایل سے کام لینا پڑا ہے۔ لیکن ناقدین فن کے لیے یہ رواج سا ہو گیا ہے کہ وہ کلام شاعر کو اس کے ذاتی احوال وکوائف کا مرقع تصور کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے شاعر نبی یا پیغمبر نہیں ہوتا لیکن اپنے حالات اور ماحول کی فضاؤں کو وہ عبور نہ کر سکے تو اس کا فن ناقص ہے۔ اسی لحاظ سے اقبالؔ اپنی بعض انسانی کمزوریوں کے باوجود ملت کا مسیحا، غمگسار، ہمدرد اور پیشوا تھا جس نے ایک

صدی کے پورے سیاسی منظرنامے کومتاثر کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور امت مسلمہ کوخواب غفلت سے بیدار کرکے قران وسنت کی روشنی میں نئی راہوں کی تلاش وجستجو کی طرف گامزن کیا۔

قاضی عدیل عباسی کے مشن اوران کی تحریک کواقبال کے ان اشعار سے سمجھا جاسکتا ہے۔

اے پیرحرم رسم ورہ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری چھوڑ
اللہ رکھے تیرے جوانوں کوسلامت
دے ان کوسبق خود شکنی خودنگری کا
توان کوسکھا خارہ شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا

قاضی عدیل عباسی اورمولانا ابوالحسن علی ندوی دونوں زندگی بھر اقبالؔ کے پیغام کی ترویج واشاعت کے لیے کوشاں رہے اور عملی اقدامات کیے۔دونوں نے اقبال کا زمانہ پایا تھا اوران سے ملاقاتیں کی تھیں۔مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ''نقوش اقبال'' کواور قاضی عدیل عباسی نے ''اقبال کا فلسفہ حیات اور شاعری'' کے ذریعہ ملت میں اقبال کے پیغام کوپہونچایا جس کوہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

☆☆☆

حوالے:۔

(۱)مولانا ابوالحسن علی ندوی،کاروان زندگی،جلد اول،مکتبہ اسلام،لکھنو ۱۹۹۴ء،ص:۴۶۲
(۲) قاضی عدیل عباسی،اقبال کا فلسفہ حیات اور شاعری، بک سروس،دہلی،۱۹۷۱ء،ص:۱۰
(۳)ایضاً،ص:۷
(۴)مولانا ابوالحسن علی ندوی،نقوش اقبال،مجلس تحقیقات ونشریات اسلام،لکھنو،۲۰۰۶ء،دسواں اڈیشن،ص:۴۶
(۵)ایضاً،ص:۷۰
(۶) قاضی عدیل عباسی،اقبال کا فلسفہ حیات اور شاعری، بک سروس،دہلی،۱۹۷۱ء،ص:۸۲
(۷)ایضاً،ص:۸۱

UGC CARE LISTED INTERNATIONAL PEER REVIEWED REFEREED JOURNAL

ISSN: 2582-1229 E-ISSN: 2581-9157

(Quarterly) **TAREEKH E ADAB E URDU**(Delhi)

Vol. 04 April - June 2022 Issue. 02

Chief Patron

Professor Irteza Karim

Editor

Professor Md. Yahya Saba

Managing Editor **Dr. Wasiqul Khair**

Associate Editor **Dr. Md. Bahlul**

Patron

Prof. Dr. Rakesh Kumar Pandey (Department of physics, Kirori Mal College, University of Delhi)
Prof. Mohd Raziur Rahman (Head, Department of Urdu, Gorakhpur University, UP)
Prof. Kausar Mazhari (Department of Urdu, Jamia Millia Islamia, Delhi)
Prof. Mohd Ali Jauhar (Department of Urdu, Aligarh Muslim University, Aligarh)
Prof. Nadeem Ahmad (Department of Urdu, Jamia Millia Islamia, delhi)
Prof. Mohammad Kazim (Department of Urdu, University of Delhi, delhi)
Prof. Mohammed Qamrul Huda Faridi (Department of Urdu, Aligarh Muslim University, Aligarh)
Prof. Zia ur Rahman Siddiqui (Department of Urdu, Aligarh Muslim University, Aligarh)
Prof. Azra Abdi, (Department of Sociology, Jamia Millia Islamia, Delhi)
Prof. Parmod Kumar Bharti (Department of Sanskirit, Municipal P.G. College Masoori, UK)

Editorial Board (India)

Dr. Md Mohsin (Delhi), Dr. Naushad Momin (Kolkata), Dr. Danish Allahabadi (Allahabad), Dr. Mujeeb Ahmad Khan (Delhi), Prof. Ale Zafar (Muzaffarpur), Dr. Mushtaque Alam Qadri (Delhi), Dr. Md Afroz Alam (Kashmir), Dr. Shahid Razmi (Bhagalpur), Dr. Saifuddin Ahmad (Delhi), Prof. Aqeela Syed Ghaus (Beedar, Maharashtra), Dr. Nadira Khatoon (Kota, Rajasthan), Dr. Balram Shukla (Delhi), Dr. Fayyaz Alam (Delhi), Prof. Zeba Mahmood (Gorakhpur), Dr. Sabiha Parween (Bhagalpur), Deen Raza Akhtar (Araria), Dr. Md Shahzad Shams (Araria), Waseem Farhat Alig. (Amrawati, Maharashtra), Shakiba Umar (Delhi), Farkhanda Jameer (Rajasthan), Md Fahim Ahmad (Kota Rajasthan), Maulana Rizwan Nadwi (Purnia), Hajra Noor Ahmad Zaryab (Sholapur, Maharashtra), Dr. Rishi Kumar Sharma (Varanasi), Qaisar Reza (Chatra, Jharkhand)

Editorial Board (Abroad)

Prof. Yusuf Khushk, Prof. Sophia Khushk, Prof. Zia ul Hassan, Dr. Mohammad Salman Bhatti, Prof. Sameena Gul. Dr. Mohammad Afzal Bat, Uzma Noreen, Dr. Rehana Kausar (Pakistan). Prof. Ahmadul Qazi (Egypt), Prof. Haleel Tuqar, Prof. Durmush Bulgar, Dr. Zakai Kardas (istanbul, Turkey), Farzana Aazam Lutfi, Dr. Ali Biyat, Dr. Q Mursi (Tehran, Iran)

Legal Advisor

Adv. Anil Kumar Singh, Adv. Seema Singh (Delhi), Adv. Md Ziaul Qamar (Patna)

April to June 2022, Vol. 04, Issue. 02, ISSN 2582-1229, E-ISSN 2582-9157

Quarterly

Tareekh e Adab e Urdu

Delhi

Editor: Prof. Md. Yahya Saba

UGC Care Listed
International Peer Review
Refreed Journal

www.tareekheadabeurdu.com